اسلامی ریاست

کا

عدالتی نظام

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

اسلامی ریاست کا عدالتی نظام

اس کتاب میں دورِ رسالتؐ سے لے کر
موجودہ دور تک اسلام کے عدالتی نظام کی
تفصیلات پیش کی گئی ہیں!

از
پروفیسر رفیع اللہ شہاب

ناشر
قانونی کُتب خانہ
کچہری روڈ، لاہور

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۝

(سورۃ النحل - آیۃ ۹۰)

(ترجمہ) اللہ تعالےٰ عدل اور احسان کا حکم دیتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

ملکِ عزیز میں جن اداروں کو اسلامی بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ادارہ عدالتی نظام کا ہے۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے عدالتی نظام کی تاریخ سے عام واقفیت ہو۔ دورِ رسالت سے لے کر، یوروپی استعمار پسندوں کے اسلامی ممالک پر قبضہ کرنے تک، مختلف اسلامی ممالک میں اسلام کا عدالتی نظام بڑی شان و شوکت سے نافذ رہا۔ اس نظام کی تفصیلات اسلامی فقہ کی ہزاروں کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ اس نظام کی کوئی ایسی مربوط تاریخ موجود نہیں، جو قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

سب سے پہلے اس ضرورت کا احساس مصر کے ایک ریٹائرڈ جج قاضی محمدؐ بن عرنوس کو ہوا اور آج سے ساٹھ سال پہلے انہوں نے اس موضوع پر "تاریخ القضاء فی الاسلام" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، اگرچہ یہ اپنے موضوع پر ایک بہترین کتاب تھی، لیکن ایک تو یہ مصر کے مقامی حالات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ دوسرے یہ آج سے ساٹھ سال پہلے لکھی گئی تھی، جب ساری اسلامی دنیا اہلِ مغرب کی محکوم تھی۔

راقم نے اپنے ملکی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو کوشش کی ہے۔ وہ قارئین کے سامنے ہے۔ اُمید ہے کہ اسلام کے عدالتی نظام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے ایک مفید کتاب پائیں گے۔

اچھرہ، لاہور — رفیع اللہ شہاب

۲۸ مئی ۱۹۸۴ء

فہرست مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

قیامِ پاکستان کے مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ برصغیر ہندو پاکستان کے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، جن کا اپنا علیحدہ مذہب اور علیحدہ طرزِ معاشرت ہے۔ وہ ایک علیحدہ وطن میں اپنے دینِ اسلام کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس مطالبے کی روشنی میں چاہیئے تو یہ تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہی ملکِ عزیز میں اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ کی فوری طور پر ابتداء کر دی جاتی، لیکن کافی عرصہ گزرنے کے بعد ابھی حال ہی میں اس کی ابتداء کی گئی ہے اور دوسرے اداروں کے ساتھ ساتھ ملک کے عدالتی نظام کو بھی اسلامی بنانے کے لئے اقدامات شروع کر دیئے گئے ہیں۔

کسی بھی ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور عامۃ الناس کو انصاف مہیا کرنے کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ جب سے انسان نے اس فانی دنیا میں آنکھیں کھولی ہیں، اسے انصاف کی طلب رہی ہے۔ ابتدائے آفرینش کے قبائلی معاشروں سے لیکر موجودہ دور کے جدید معاشرے تک انصاف مہیا کرنے کے نظام نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ چونکہ اس نظام کا ملک کی خوشحالی سے گہرا تعلق ہوتا ہے اسلیئے خوشحال

قومیں اپنے اپنے ممالک کے عدالتی نظام پر فخر کرتی ہیں۔

اسلام سے پہلے بہت سے عدالتی نظام اس دنیا میں رائج رہ چکے ہیں۔ ان کی کچھ تفصیلات آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔ دوسرے عدالتی نظاموں کی طرح اسلام کا عدالتی نظام بھی مختلف ادوار سے گزرا ہے۔ ان مختلف ادوار کی خصوصیات کے لحاظ سے اس نظام کی تفصیلات اگلے صفحات میں پیش کی جارہی ہیں۔ اسلام کا پہلا دور یعنی دورِ رسالت ؐ، اس نظام کا مثالی دور تھا۔ اس دور میں جب عدالتی نظام کی بنیادیں رکھی گئیں وہ بعد کے ادوار کے لئے ایک مکمل قابل تقلید نمونہ بن گیا۔

اسلام محض قانون کے نفاذ اور مجرموں کو سزا دینے پر اصرار نہیں کرتا، بلکہ وہ اس مقصد کے لئے ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے کہ جس میں سرے سے جرائم وقوع پذیر ہی نہ ہوں، بلکہ وہ کوشش کرتا ہے کہ جرائم کے سرچشموں ہی کو ختم کر دیا جائے، اس مقصد کے لئے اسلام نے ہر ممکن طریقے سے سادگی اپنانے کی ترغیب دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس سادگی کا مکمل نمونہ تھی۔ آپ عام مسلمانوں کی طرح سادہ مکان میں رہتے تھے اور مسلمانوں سے بھی یہی توقع کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب ایک صحابی نے شاندار مکان تعمیر کرایا تو آپ سخت ناراض ہوئے۔

زمین کی ملکیت کی وجہ سے اکثر جھگڑے جنم لیتے ہیں اور آج بھی مقدمات کی کثیر تعداد کی بنیاد یہی زمین ہے، لیکن جب اسلامی معاشرہ قائم ہو گیا تو آپ نے زمین کی خرید و فروخت کی ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ صرف استعمال کی زمین اپنے پاس رکھی جائے اور ضرورت سے زیادہ زمین اپنے مسلمان بھائیوں

کو مفت دے دی جائے۔ حضرت جابرؓ کی ایک مشہور روایت ہے، جسے بخاری اور مسلم نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے :۔

کان لرجالٍ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من فضول ارضین۔ فقال رسول اللہ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام من کان لہٗ ارض فلیزرعھا او یمنحھا اخاہ فان ابی فلیمسك ارضہ‘۔ [1]

(ترجمہ) بعض صحابہ کرامؓ کے پاس زائد زمینیں تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو بخش دے اور اگر بخشنے سے انکار کرے تو پھر اپنی زمین کو 'روک' رکھے۔

اس موضوع پر کوئی ایک درجن احادیث ہیں اور صحابہؓ نے بار بار زمین فروخت کرنے کی اجازت مانگی۔ لیکن اجازت دینے کی بجائے آپؐ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور ناراضگی کے لہجے ہی میں فرمایا کہ اگر اپنے بھائی کو مفت نہیں دے سکتا تو 'روک رکھے'۔ اس فیصلے کا یہ شاندار نتیجہ نکلا کہ اسلامی معاشرے میں بہت کم جھگڑے پیدا ہوئے۔ دورِ رسالت تو خیر اسلام کا سنہری دور تھا، صدیق اکبرؓ کے دورِ حکومت میں کہ جب حضرت عمرؓ ان کے قاضی تھے ایک بھی مقدمہ پیش نہ ہوا۔

لیکن بعد کے زمانوں میں مسلمانوں میں تقویٰ کی کمی ہو گئی اور ملوکیت

---

[1] نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، مطبوعہ مصر، جلد پنجم ص ۲۹۵

نے اسلام کی سادہ اور خالص تعلیمات کو مسخ کرنا شروع کر دیا، زمین کی شرعی حیثیت کو ختم کر کے اس کی خرید و فروخت کی اجازت دے دی گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار ہو گئی۔ اموی خلفاء میں سے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ اور عباسی خلفاء میں سے ابوجعفر منصورؒ نے اس خرابی کو محسوس کیا تو انہوں نے سنئے اقدامات کو منسوخ کر کے اراضی کی پرانی شرعی حیثیت کو بحال کیا، لیکن یہ انفرادی کوششیں تھیں جو ملوکیت کی یلغار کے آگے زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں۔ اس بارے میں تفصیلات مستند اسلامی کتابوں سے اکٹھی کر کے کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں۔

ان گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے عدالتی نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ وجود میں لایا جائے جس کا نمونہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ اس سے چونکہ مفاد پرستوں کے ناجائز مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ اس لئے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اسلامی معاشرے کے قیام کو روکیں گے، لیکن اگر اس سلسلے میں اخلاص سے کوششیں جاری رکھی گئیں تو اللہ تعالیٰ حق کا بول بالا کرے گا۔

باب اوّل

قبل اسلام کے عدالتی نظام

اسلامی ریاست کے عدالتی نظام کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے قبل جو دوسرے ایسے نظام اس زمانے میں موجود تھے، ان کی ایک جھلک پیش کر دی جائے۔ ان نظاموں کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ انہیں ناقص حالت میں پیش کر کے، ان پر تنقید کی جائے اور پھر اسلام کے عدالتی نظام کی برتری ثابت کی جائے اور نہ ہی ایک باب میں۔ اتنے بڑے عدالتی نظاموں سے انصاف ہو سکتا ہے۔ ان نظاموں کی جھلک دکھانے کا مقصد یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو عدالتی نظام موجود تھے۔ وہ کافی ترقی یافتہ تھے لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ ہوتے گئے۔ تاہم یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ اسلام کے عدالتی نظام کا ٹھیک ٹھیک موازنہ صرف عرب کے زمانۂ جاہلیت کے عدالتی نظام سے ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام نے اسے بالکل رد نہیں کیا تھا، بلکہ اس کی اچھی چیزوں کو اپنا لیا تھا، اور اس کی بُری باتوں کو ختم کر دیا گیا تھا، علّامہ احمد امین مصری نے اسلامی تہذیب و تمدن پر اپنی مشہور کتاب "فجر الاسلام" کے چھٹے باب کی تیسری فصل میں زمانۂ قبل از اسلام کے عدالتی نظاموں کا نہایت عمدہ تعارف کرایا ہے۔ عام مسلمان اہلِ قلم کی طرح علّامہ صاحب نے زمانۂ جاہلیت کا مرتبہ

گھٹانے کے لیئے ان کی اچھی باتوں میں کمی بیشی نہیں کی، اس لیئے ہمارے مقصد کے لیئے علّامہ صاحب کے اس تعارف کا خلاصہ پیش کر دینا کافی ہے۔

زمانۂ جاہلیّت کا عدالتی نظام

زمانۂ جاہلیّت کے عرب زیادہ تر بادیہ نشین تھے، ان کی کوئی منظم حکومت نہ تھی۔ نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا، کہ جو حکومت کی طاقت سے لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکتا۔ ان کے ہاں مختلف قبیلے ہوتے تھے، افرادِ قبیلہ کو قبیلہ کی حمایت سے فائدہ اٹھانے اور اسے اپنی مدد کے لیئے پکارنے کا حق ہوتا تھا۔ یہ پورے قبیلے کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے ہر فرد کی حفاظت کرے۔ اور اگر کسی دوسرے قبیلے کا شخص اسے قتل کر دے، تو اس کے خون کے بدلے کا مطالبہ کرے۔ اس کے بدلے قبیلے کے ہر فرد کا یہ فرض تھا کہ وہ اس عرف اور رواجات کو کہ جن کے مطابق قبیلے کا نظام چلتا تھا، کو صدقِ دل سے تسلیم کرے۔ قبیلے کے نظام کا محور اس کا سردار ہوتا تھا اور تمام افرادِ قبیلہ اس کی سرداری کو تسلیم کرتے تھے۔

عربوں کے قاضی اور حَکَم

جزیرہ نمائے عرب میں سینکڑوں قبیلے آباد تھے، اور ہر قبیلے کا علیحدہ سردار ہوتا تھا۔ عام طور پر ہر قبیلے کے اپنے علیحدہ رسم و رواج ہوتے تھے۔ جن میں سے کچھ تو بعض اوقات مشترک ہوتے تھے اور کچھ الگ الگ، یہ باہمی فرق اور اختلاف، بادیہ نشینی سے قُرب اور بُعد کی وجہ سے پیدا ہو جاتا تھا۔ سردار کے علاوہ ہر قبیلے کا ایک قاضی بھی ہوتا

تھا جسے وہ حَکَم کہتے تھے۔ وہ قبیلے کے مختلف افراد کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ قبیلے کے رسم و رواج اور اپنے تجربات کے مطابق کرتا تھا۔ چنانچہ کتاب الاغانی میں زمانۂ جاہلیّت کی مشہور شخصیت اکثم بن صیفی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں عربوں کے قاضی تھے۔ علاّمہ المیدانی نے عامر بن الظرب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی ایک ایسے ہی قاضی تھے، زمانۂ جاہلیّت کے عرب، اس کی سمجھ کے مقابلے میں کسی کی سمجھ کو اور اس کے فیصلے کے مقابلے میں کسی کے فیصلے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

عربی ادب کی کتب میں تلاش کرنے سے ہمیں نظر آتا ہے کہ زمانۂ جاہلیّت کے عرب کبھی تو اپنے تنازعات کے فیصلوں کے لئے قبیلے کے سردار کے پاس جاتے تھے، اور کبھی اس مقصد کے لئے کاہن کا دروازہ کھٹکاتے تھے۔ بعض اوقات وہ ایسے شخص سے بھی اپنے تنازعات کے فیصلے کے لئے درخواست کرتے تھے، جو عمدگیٔ رائے اور اصابت رائے میں ان کے ہاں مشہور ہو جاتا تھا۔ ان تینوں ہستیوں یعنی سردار قبیلہ، کاہن اور اصابتِ رائے والے شخص میں سے ہر ایک خصوصیّت کے ساتھ کس کس قسم کے معاملات میں فیصلے دیتا تھا، اس کے لئے فاصل حدود مقرر کرنا نہایت ہی دشوار ہے بلکہ ہمیں تو اس امر میں بھی شک ہے کہ ایسی کوئی فاصل حدود موجود بھی تھیں یا کہ نہیں۔ بس مختلف لوگ اپنے اپنے مزاج کے قاضیوں کے پاس اپنے مقدمات لے جاتے تھے۔

یہ قاضی یا حَکَم کسی مدون قانون یا مقررہ قواعد و ضوابط کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ اپنے فیصلوں میں قبائل کے عرف

اور رسم و رواج ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، جو کبھی تو تجربات پر مبنی ہوتے تھے، اور کبھی ان کے اپنے اعتقادات پر۔ بعض اوقات یہ فیصلے ان احکامات پر مبنی ہوتے تھے، جو یہودی مذہب کے ذریعے ان تک پہنچ گئے تھے۔ اس جاہلی قانون کا جو عرف اور رسم و رواج پر مبنی ہوتا تھا۔ کوئی معاوضہ مقرر نہیں تھا۔ تنازعے کے فریقین اس امر پر مجبور نہیں تھے کہ وہ فیصلے کے لئے ضرور کسی قاضی یا حَکَمْ کے پاس جائیں اور اس کے فیصلے کو لازماً تسلیم کریں۔ اگر وہ فیصلے کے لئے کسی کے پاس جاتے تھے تو یہ ان کی اپنی مرضی پر منحصر تھا۔ قانونی طور پر یا رسماً وہ اس کے لئے مجبور نہیں تھے۔ پھر جب فیصلہ صادر ہو جاتا تو فریقین کا جی چاہتا تو اسے تسلیم کر لیتے، جی نہ چاہتا تو تسلیم نہ کرتے، تاہم ایسا فیصلہ تسلیم نہ کرنے پر انہیں سارے قبیلے کی ناراضگی ضرور مول لینی پڑتی تھی۔

عربی ادب کی کتابوں میں زمانۂ جاہلیت کے ان باہمی تنازعات کے بہت سے فیصلے منقول ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر ایک قبیلے کی دو اہم شخصیتوں کے درمیان اس بات پر تنازعہ ہو گیا کہ ان میں سے بڑا سردار کون ہے؟ دونوں فیصلے کے لئے حَکَمْ یا ثالث کے پاس گئے۔ حَکَمْ نے جس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ وہ فضیلت اور شرف سے ممتاز ہو گیا اور قبیلے کے لوگ اسے سردار تسلیم کر لیتے، جس کے خلاف فیصلہ ہوا، اسے شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ان حَکَمْ کو آجکل کی اصطلاح میں ہم ثالث کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ان کا کوئی سرکاری اختیار یا قانونی غلبہ نہیں تھا، حکومت تو ان کے ہاں تھی ہی نہیں اور نہ ہی کوئی بادشاہ تھا، کہ فریقین اس کے سامنے فیصلے کرانے کے لئے جانے پر مجبور ہوں، زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ ایک آدمی ان میں

صحتِ رائے، عمدگیٔ فیصلہ اور ان کے وقائع اور انساب کے متعلق وسعتِ علم میں مشہور ہو جاتا تھا، اور وہ اسے اپنا حَکَم یا ثالث تسلیم کر لیتے تھے۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں باب القسامۃ میں اسلام کی ابتداء سے ذرا پہلے کے ایک خونیں جھگڑے کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ بنو ہاشم کے ایک آدمی کو قریش کے کسی دوسرے خاندان کے ایک آدمی نے اجرت پر ملازم رکھا اور اسے لے کر اپنے اونٹوں میں چلا گیا۔ اتفاقاً بنو ہاشم کے کسی آدمی کا اُدھر سے گزر ہوا، جس کے اونٹ کے تھیلے، جسے عربی زبان میں خرجین کہا جاتا ہے کی رسی ٹوٹ گئی۔ اس نے اس ہاشمی سے کہا کہ میری مدد کرو، ایک رسی مجھے دے دو۔ جس سے میں اپنے اونٹ کے خرجین کا منہ باندھ دوں، تاکہ اونٹ بدک نہ جائے۔ اس ہاشمی ملازم نے اس دوسرے ہاشمی کو ایک رسی دے دی، اور وہ چلا گیا۔ جب منزل پر اُترے تو اس ہاشمی ملازم نے تمام اونٹ تو باندھ دیئے، مگر ایک اونٹ بندھنے سے رہ گیا۔ مالک نے پوچھا کہ یہ اونٹ کیوں نہیں باندھا؟ ملازم نے بتایا کہ اس کی رسی نہیں ہے۔ مالک نے کہا کہ اس کی رسی کہاں گئی اور لکڑی اٹھا کر اسے پیٹنا شروع کیا، جس سے وہ قریب المرگ ہو گیا۔ ابھی وہ زندہ ہی تھا کہ یمن کے ایک آدمی کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس ہاشمی ملازم نے اس سے کہا کہ جب کبھی ممکن ہو سکے، وہ اس کا ایک پیغام اس کے قبیلے تک پہنچا دے۔ یمنی نے وعدہ کر لیا۔ ہاشمی ملازم نے کہا کہ جب کبھی حج کے لئے تیرا جانا ہو تو مکّہ معظمہ پہنچ کر پہلے قریش کو پکارنا، جب سارے قریش جمع ہو جائیں تو پھر بنو ہاشم کو پکارنا۔ جب سارے بنو ہاشم جمع ہو جائیں تو پوچھنا کہ ان میں ابو طالب کون ہیں؟ اور ابو طالب کو بتا دینا کہ مجھے فلاں شخص

نے ایک رسی کی گمشدگی کی وجہ سے قتل کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ ہاشمی ملازم ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ جب اونٹوں کا مالک مکہ مکرمہ واپس آیا تو جناب ابوطالب اس کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ ہمارے خاندان کا وہ ہاشمی جوان کہاں گیا؟ جسے تم ملازم بنا کر لے گئے تھے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ بیمار ہو گیا تھا اور یہ کہ اس نے اس کی بڑی خدمت کی تھی، مگر وہ جانبر نہ ہو سکا۔ بالآخر وہ مر گیا اور اس نے اسے دفن کر دیا۔ اس وضاحت سے جناب ابوطالب مطمئن ہو گئے اور کہنے لگے کہ تم سے اسی کی توقع تھی۔

زمانہ یونہی گزرتا گیا، تاآنکہ وہ یمنی شخص، جسے اس ہاشمی ملازم نے وصیت کی تھی، حج کے لئے آیا، اور پوچھتا پوچھتا سیدھا ابوطالب کے پاس پہنچا اور بتایا کہ مجھے فلاں آدمی نے ایک پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے دیا تھا، اور وہ پیغام یہ تھا کہ اسے فلاں آدمی نے اونٹ کی ایک رسی کی گمشدگی کی وجہ سے قتل کر دیا تھا۔ جناب ابوطالب یہ سنتے ہی اونٹوں کے مالک کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ ہم تجھے تین باتوں کا اختیار دیتے ہیں۔ ان میں سے جونسی بات چاہو منظور کر لو۔ چاہو تو ایک صد اونٹ خون بہا کا ادا کر دو۔ کیونکہ تم نے ہمارے آدمی کو قتل کیا ہے۔ اگر یہ قابلِ قبول نہیں، تو تمہارے خاندان کے پچاس آدمی حلف اٹھائیں کہ تم نے اُسے قتل نہیں کیا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں منظور نہ ہوں تو پھر ہم تمہیں اس آدمی کے بدلے میں قتل کر دیں گے۔ الخ حدیث"

مکّہ معظمہ کا عدالتی نظام

اس حدیث سے زمانہ جاہلیت کے عدالتی نظام کی بہت سی اقسام پر روشنی پڑتی

ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکّہ معظمہ اسلام سے پہلے اپنے شہری نظامِ حکومت میں کافی ترقی کر چکا تھا۔ جس کا ایک شعبہ عدالتی نظام بھی تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مکّہ معظمہ میں دس خاندانوں میں دس خدمات بٹی ہوئی تھیں۔ مثلاً دربانیٔ کعبہ، سقایہ یعنی حاجیوں کی مفت خاطر و تواضع، مہمان نوازی، شوریٰ اور علَم برداری وغیرہ وغیرہ۔ ان خدمات میں سے ایک خدمت ایسی بھی تھی، جو عدالتی نظام سے تعلق رکھتی تھی، اور زمانۂ جاہلیّت میں حضرت ابوبکرؓ کے حوالے تھی۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے ذمّے مالیاتی شعبے کے امور تھے۔ یعنی قتل کے مقدمات کے فیصلوں میں خون بہا اور تاوان وغیرہ کا انتظام ان کے ذمّے تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بعض قبائلِ قریش نے متفقہ طور پر حلف الفضول[1] کا معاہدہ کیا تھا۔ جس کے تحت انہوں نے اس امر کے لئے حلف اٹھائے تھے کہ مکّہ معظمہ میں وہ کسی اجنبی مسافر اور اپنے واقف رشتہ دار پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ کسی آزاد یا غلام پر اگر ظلم ہوا تو وہ اس وقت تک اس کا ساتھ دیں گے جب تک اس کا حق اسے نہ دلوا دیں۔ اگر اس پر کوئی زیادتی ہوگی تو وہ اپنے پاس سے اس کو ادا کر دیں گے یا دوسروں سے دلوائیں گے۔

شریعتِ اسلامی نے زمانۂ جاہلیّت کے عربوں کے عرف اور ان کے رسم و رواج کے ساتھ بے تعلقی نہیں برتی۔ بلکہ ان میں سے بعض باتوں کو اسلام میں بھی برقرار رہنے دیا گیا۔ بعض باتوں میں ترمیم کر کے انہیں معتدل

---

[1] حلف الفضول کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ اس معاہدے کی تکمیل کرنے والے تمام حضرات کے نام میں "فضل" آتا تھا۔ ۱۲۔

بنا دیا گیا۔ جب کہ بعض چیزوں کو بالکل ختم کر دیا۔ مثلاً جن چیزوں کو باقی رکھا ان میں سے ایک یہ قسامت کے ذریعے مشتبۂ قتل کے معاملات کا تصفیہ بھی تھا۔ یعنی اگر کسی قتل کے مقدمے میں واضح ثبوت نہ ملتا تو جائے وقوعہ کے ارد گرد کے پچاس لوگوں سے حلف لئے جاتے تھے کہ وہ اس قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

امام مسلم اور نسائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے زمانۂ جاہلیت کے "قسامت کے ادارے" کو اسی انداز میں باقی رہنے دیا۔ جس انداز پہ کہ زمانۂ جاہلیت میں اس پہ عمل ہوتا تھا اور اس کے مطابق ایک مقتول کے بارے میں انصار کے کچھ لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا تھا، جس کے قتل کا دعویٰ انہوں نے خیبر کے یہودیوں کے خلاف کیا تھا[1] یعنی خیبر کے جس مقام پہ انصاری کا قتل ہوا تھا، وہاں کے پچاس لوگوں سے اس بارے میں قسمیں اٹھوائی گئی تھیں۔

شریعتِ اسلامی نے زمانۂ جاہلیت کے بعض احکامات کو جو حج، نکاح، طلاق، مہر، خلع اور ایلاء وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے انہیں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ معتدل بنا لیا تھا، تاہم زمانۂ جاہلیت کے بہت سے رواجوں کو اسلام نے لغو قرار دے دیا تھا۔ مثلاً کسی دوسرے کے بچے کو گود میں لے کر اسے اپنا حقیقی بیٹا بنا لینے کا عربوں میں عام طور پہ رواج تھا، اسے حقیقی بیٹے کا درجہ دے کر وراثت میں اس کو باقاعدہ حصہ دیا جاتا تھا۔ اسلام نے اسے قطعاً لغو قرار دے دیا۔ خرید و فروخت کی بعض صورتوں میں

---

[1] تیسیر الاصول فی جمع احادیثِ الرسول جلد سوم صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ مصر۔

پتھر پھینک کر، ہاتھ سے چھو کر اور کنکری مار کر تجارتی سودے کئے جاتے تھے اسلام نے ایسے تمام کاروبار کو خلافِ شریعت قرار دے دیا۔ اگر ہم تفصیل سے زمانۂ جاہلیّت کے اس نظام کو بیان کریں اور پھر یہ بتائیں کہ شریعتِ اسلامی نے ان میں سے کن چیزوں کو معتدل بنا کر اختیار کر لیا تھا اور کن کن چیزوں کو لغو قرار دے دیا تھا، تو بات بہت لمبی ہو جائے گی، اس لئے انہی مختصر گزارشات پر ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ [1]

مدینۂ منوّرہ کا عدالتی نظام

مدینۂ منوّرہ میں اسلام سے پہلے عدالتی نظام اور قانون کا تصوّر، دوسرے مقامات اور شہروں کی نسبت کسی قدر ترقی یافتہ تھا، کیونکہ یہاں کے عرب، یہودیوں کے ساتھ کافی اختلاط رکھتے تھے اور یہودیوں کے پاس تورات اور اس کی شرحیں موجود تھیں، جن میں احکام اور قوانین پائے جاتے تھے اور مدینہ کے لوگ عام حالات میں یہودی قانون کی پیروی کرتے تھے۔

زمانۂ جاہلیّت میں کاہن کا مقام

لیکن اس کے باوجود ان کے عدالتی نظام میں بھی کاہن کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، علامہ احمد امین نے کاہن اور حلف الفضول کے بارے میں صرف اشارہ کیا ہے۔ ہم اس کی کچھ مزید تفصیلات پیش کرتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیّت کے کاہن، علمِ غیب کے مدعی تھے، اور اکثر اوقات

---

[1] علامہ احمد امین کی کتاب "فجر الاسلام" کے چھٹے باب کی تیسری فصل سے متعلقہ عبارت کا خلاصہ۔

وہ ان عربوں کے لئے مذہبی پیشواؤں کی حیثیت رکھتے تھے۔ عام طور پہ صرف پیچیدہ قسم کے مقدمات میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ شق، اور سطیح زمانۂ جاہلیت کے دو مشہور کاہن تھے۔ قصوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کاہن بعض اوقات متنازعے کے فریقین کے بیانات سننے سے پہلے ہی صحیح فیصلہ گنگنا نے لگتے تھے۔ عربوں میں چونکہ حکومت کا کوئی وجود نہیں تھا، اس لئے کاہنوں کے فیصلوں کی تعمیل کرانے کے لئے کوئی سرکاری ادارہ موجود نہ تھا، لیکن عام لوگوں کو ان پر اس حد تک یقین و اعتماد ہوتا تھا کہ فریقین خوشی خوشی ان کے صادر کردہ فیصلوں کو تسلیم کر لیتے تھے۔ کاہنوں کی حیثیت اگرچہ نجی ہوتی تھی، لیکن تنازعات میں وہ قانون دانوں کی حیثیت سے کام کرتے تھے، اگرچہ کاہن اور حَکَم کے مفہوم میں بہت کم فرق سمجھا جاتا تھا، لیکن کاہن کے فیصلوں کو خدائی فیصلہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے ان کے خلاف کوئی انگلی تک نہیں اٹھاتا تھا، جب کہ کاہن کے مقابلے میں حَکَم یعنی ثالث کے فیصلوں کو خدائی فیصلے کا درجہ نہیں دیا جاتا تھا، اور فریقین اس پہ اعتراض کر سکتے تھے۔

حِلفُ الفضُول

حلف الفضول مکہ معظمہ میں ایک قسم کا سماجی ادارہ تھا، جس کا آغاز قبائل جرہم کے یہاں آباد ہونے کے دور سے ہو چکا تھا، حرب فجار کے بعد یہی ادارہ پھر زندہ ہوا۔ یہ ایک اجتماعی حلف تھا، اور اس کی ایک تاریخی اہمیت یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تکمیل میں حصّہ لیا تھا۔ یہ دراصل ایک رضاکار جماعت کا سمجھوتہ تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ شہری حدود میں

جو مظلوم پائے جائیں، اُن کی مدد کی جائے، اور ظالم کو سزا دی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت کے بعد بھی اس جماعت کے کاموں میں حصّہ لیا۔ اور اس پر آپؐ کو فخر تھا۔ یہ رضا کار جماعت بنو امیّہ کے عہد کی ابتداء تک اپنے مقصد کے لئے کام کرتی رہی۔

انصاف رسانی کے ان مختلف طریقوں کے باوجود زمانۂ جاہلیّت میں کسی مرکزی حاکمِ عدالت کا پتہ نہیں چلتا۔ وکلاء کا کوئی ادارہ نہ تھا۔ فریقین بذاتِ خود انصاف چاہتے تھے اور کاہن یا حَکَمْ ان کی شکایات سن کر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے دیتے تھے۔

یہود کا عدالتی نظام

مدینہ منوّرہ کے عدالتی نظام کے ضمن میں یہود کے عدالتی نظام کا ذکر ہوا تھا۔ یہود اہلِ کتاب تھے اور ان کا عدالتی نظام اس حد تک ترقی یافتہ تھا کہ ۱۸۰۷ء میں نپولین شاہ فرانس نے اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

یہ نظام ایک مرکزی عدالتِ عالیہ کے تحت ہوا کرتا تھا، جس کا نام سنھدرین (SANHEDRIN) تھا، یہودی روایات کے مطابق یہ ایک نظریاتی طرز کی عدالت تھی۔ ۳۰ء تک یہ عدالت، صرف عدالتِ عالیہ کے فرائض سرانجام دیتی تھی، اس کے بعد اس کے سیاسی اختیارات واپس لے لئے گئے، اور اس کا دائرہ کار، صرف شہری اور مذہبی قوانین تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ہر دَور میں اس کے اراکین کی تعداد کافی ہوتی تھی جو مختلف بورڈ بنا کر مختلف قسم کے تنازعات کے فیصلے کرتے تھے۔

رومن دورِ حکومت میں یہودیوں کی اس عدالتِ عالیہ کے اراکین

کی تعداد اکہتر تھی ۔ اور اس کے دو حصے تھے ۔ ایک حصہ فوجداری مقدمات کے فیصلے کرتا تھا ، جبکہ دوسرے حصے کے سپرد عام شہری معاملات تھے ۔ یہودیوں کا سب سے بڑا مذہبی لیڈر ، اس عدالت کا چیئرمین ہوتا تھا ، یہی لیڈر قانون کی جو تعبیر کرتا تھا ، وہ سب کے نزدیک قابلِ تسلیم تھی ۔ اس کے علاوہ مذہبی رسوم کی پابندی کرانا بھی اس کی ذمہ داری تھی اور جنتری کیلنڈر وغیرہ کے مطابق تاریخوں کا تعین بھی اسی کے مشورے سے ہوتا تھا ۔ پانچویں صدی مسیح تک فلسطین میں یہ عدالت ، پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرتی رہی[1] ۔ تاہم یونانی دور سے پہلے یہودی عدالتوں کا کوئی نشان نہیں ملتا ۔ کیونکہ خود ان کا اپنا ایک علیحدہ منظم نظام موجود تھا ۔

خیال رہے کہ یہود کے عدالتی نظام کی سرکاری حیثیت ختم ہونے کے بعد مختلف ممالک میں یہودیوں نے اپنے لئے جو پرائیویٹ عدالتیں قائم کر رکھی تھیں ۔ وہ سب اسی عدالتِ عالیہ کا چربہ تھیں اور چونکہ یہ کافی ترقی یافتہ تھیں ۔ اس لئے متعلقہ ممالک کے عدالتی نظام پر اثر انداز ہوتی تھیں ۔ اور اسی خیال کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے ، کہ یہود کے عدالتی نظام نے مدینہ منورہ کے عدالتی نظام پر گہرا اثر ڈالا تھا ۔

یونان کا عدالتی نظام

یہود سے پہلے جس عدالتی نظام کا پتہ چلتا ہے ۔ وہ قدیم یونان کا عدالتی نظام تھا جو

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۱۱ صفحہ ۱۹۵

اپنی اتنی قدامت کے باوجود بھی ہمارے موجودہ ترقی یافتہ دور کے عدالتی نظاموں سے کچھ ملتا جلتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مغربی عدالتی نظام نے اس سے خوشہ چینی کی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ حالات کے مطابق عدالت کا انچارج یا تو کوئی ایک مجسٹریٹ ہوتا تھا، یا ان مجسٹریٹوں کا ایک بورڈ بنا دیا جاتا تھا۔ یہ بورڈ مقدمے کی ابتدائی کارروائی سنتا، اور تمام متعلقہ ریکارڈ کی دستاویزات اکٹھی کرتا تھا، تاہم آجکل کے عدالتی نظام کی طرح یہ مجسٹریٹ یا ان پر مشتمل عدالتی بورڈ، ماہرینِ قانون پر مشتمل نہ ہوتے تھے۔ بلکہ اس مقصد کے لئے عام انتخابات ہوتے اور کسی بھی شخص کو عدالتی بورڈ کا ممبر بنانے کے لئے ووٹ دیئے جا سکتے تھے۔ ان کے عہدے کی معیاد ایک سال ہوتی تھی۔ بعض اوقات عدالت کا یہ بورڈ پانچ صد افراد سے بھی زیادہ پر مشتمل ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ عوامی مجسٹریٹ کسی تنازعے کے حل کے لئے بیٹھتے ہوں گے تو بہت سی غیر ضروری باتیں بھی ہوتی ہوں گی اور مقدمات کافی طوالت اختیار کرتے ہوں گے۔ چونکہ قدیم یونان کی اس عدالت کی ہیئتِ ترکیبی، سیاسی نوعیت کی تھی۔ اس لئے اس کے فیصلوں پر بھی سیاست اثر انداز ہوتی تھی، اور عام طور پر موقع و محل کے لحاظ سے فیصلے کئے جاتے تھے۔ اس کام کے لئے ان مجسٹریٹوں کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی، جو زیادہ تر جرمانوں سے پوری کی جاتی تھی، جو مختلف مجرموں سے وصول کئے جاتے تھے، اس لئے ان عدالتوں کے زیادہ تر فیصلے جرمانوں کی صورت میں ہوتے، تاکہ مجسٹریٹوں کی تنخواہوں کے لئے رقم ملتی رہے۔ [۱]

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس جلد ۴ صفحہ ۲۷۵

ہندوؤں کا عدالتی نظام

ہندوؤں کی مشہور قانونی دستاویز منوسمرتی کے مطابق ہندوؤں کے قدیم عدالتی نظام کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ بھی کافی ترقی یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نظام کے مطابق، تنازعات کے فیصلوں کی ذمہ داری، ہندو راجہ کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کوئی علیحدہ ادارہ نہ تھا۔ پھر مجرم کو سزا دینے کے لئے راجہ کی رہنمائی کے لئے عدل کے چار درجے مقرر کئے گئے تھے، پہلے درجے پر وہ مجرم کو سرزنش کر کے چھوڑ دیتا۔ اس کے بعد اگر وہ دوبارہ جرم کرتا تو اسے لعن طعن کی جاتی (REPROOF) اور پھر جھڑک کر اُسے رہا کر دیا جاتا۔ تیسرے مرحلے پر جرمانے کی سزا مقرر تھی، اور آخری اور چوتھے درجے پر بدنی سزا دی جاتی تھی، لیکن ہندو قوم چونکہ ہر معاملے میں مالی فائدے کو زیادہ اہمیت دیتی تھی اس لئے سزا دیتے وقت زیادہ تر تیسرے مرحلے کو سامنے رکھا جاتا، اور زیادہ تر سزائیں جرمانوں پر مشتمل ہوتی تھیں، اور دوسرے درجوں کا بہت کم استعمال کیا جاتا تھا۔ [1]

رومن عدالتی نظام

اسلامی دور سے پہلے جتنے بھی عدالتی نظام موجود تھے، ان میں سے رومن عدالتی نظام سب سے زیادہ منظم نظام شمار کیا جاتا تھا۔ اگرچہ شروع شروع میں رومن قانون صرف روم شہر تک محدود تھا۔ لیکن بعد میں اس کا اطلاق دوسرے علاقوں تک بھی ہوتا گیا، اور صدیوں تک تمام یورپ میں اس کا ڈنکا بجتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر کے اس قانون کی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس، جلد ۴، صفحہ ۳۸۴

برتری کو ختم کر دیا اور یورپ کے بہت سے علاقوں میں اسلامی قانون کو متعارف کرا دیا۔ تاہم یہ نظام ایسا سخت جان تھا کہ یورپ کے بہت سے ممالک خاص کر جرمنی میں یہ ۱۹۰۰ء تک من وعن رائج رہا۔ اور آج بھی جیسا کہ اس کی تفصیلات سے معلوم ہو گا۔ کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے تمام ممالک، بشمول اسلامی ممالک کے عدالتی نظاموں میں، اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس نظام کی ابتدائی صورت تو بڑی سادہ تھی، اور دوسرے نظاموں کی طرح، اس کی بھی یہ خصوصیت تھی کہ وہ سب کے سب رضاکارانہ ثالثی فیصلے ہوتے تھے۔ مقدمے کے فریقین مجسٹریٹ کے پاس اپنا معاملہ لے جاتے، جو اُن کے دلائل سُن لینے کے بعد منصفانہ فیصلہ کر دیتا۔ اگرچہ یہ نظام سرکاری نگرانی میں قائم تھا، لیکن کسی فریق کو ایسا فیصلہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک قسم کے ثالثی فیصلے ہوتے تھے۔[1]

رومن عدالتی نظام اور شاہ جسٹینین

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اور رومن ایمپائر کی حدود میں وسعت کی وجہ سے، اس سادہ نظام میں کافی تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں، خاص طور پر شاہ جسٹینین (JUSTINIAN) کا دَور اور اس کے بعد کا دَور، ان تبدیلیوں کے لئے مشہور ہے۔ شاہ جسٹینین نے ۵۳۴ء اور ۵۶۵ء کے درمیان ہزاروں فرمان جاری کئے جن کے ذریعے، قدیم رومن قانون میں اصلاح کی گئی۔ بہت سی صورتوں میں تو قدیم رومی قانون

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد ۱۹ صفحہ ۵۵۲

کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا گیا، خاص طور پر مقدمات کے لئے طریقِ کار میں کافی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ مقدمات کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلے حصّے میں عدالت میں اس پر بحث سے پہلے تفتیش کے ذریعے مسل تیار کی جاتی اور مقدمے کے دوسرے حصے میں یہ مسل عدالت میں پیش کی جاتی۔ مجسٹریٹ شاہی افسر ہوتے اور ان کے پاس عدالتی اختیارات کے علاوہ وسیع انتظامی اختیارات بھی ہوتے۔ یہ مجسٹریٹ صاحبان اکثر مقدمات کے فیصلے کے لئے اپنے عدالتی اختیارات کی نسبت اپنے انتظامی اختیارات کو زیادہ استعمال میں لاتے تھے۔ اگر کوئی مدعی عدالت میں مقدمہ دائر کرتا، تو مجسٹریٹ مختلف اہل کاروں کو اس کی تفتیش مکمل کرنے کا حکم دیتا، اور جب کاغذات تیار ہو کر آجاتے تو پھر وہ ان کی روشنی میں اپنا عدالتی فیصلہ صادر کر دیتا۔ جسے فریقین کے لئے تسلیم کرنا لازمی ہوتا۔ کیونکہ رومن مجسٹریٹ اپنے وسیع انتظامی اختیارات کی بنا پر ان پر عمل کرانے کی بہتر پوزیشن میں ہوتا۔ ترکوں کے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینے کے بعد اس عدالتی نظام کو ایک دھچکا سا ضرور لگا۔ لیکن اس کے بعد یہ یورپ کے بہت سے مختلف ممالک میں کافی عرصے تک قائم رہا، بلکہ آج بھی پاکستان سمیت بہت سے اسلامی ممالک میں یہ نظام جزوی طور پر رائج ہے۔

ایران کا عدالتی نظام

اسلام سے پہلے کے دَور میں بھی ایران کا عدالتی نظام کافی منظم تھا، اور اسے کسی پہلو سے غیر معیاری نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے ایک بادشاہ انوشیروان کا عدل تو دنیائے عدل میں ضربُ المثل کی حد

تک مشہور ہے۔ اگرچہ اس نظام میں بادشاہ خود عدلیہ کے فرائض سرانجام دیتا تھا، تاہم قانونی طور پر یہ نظام ایک عدالتِ عالیہ کے سپرد تھا جس کا سربراہ "موبذِ موبذان" کے لقب سے مشہور تھا، ملک کی تمام عدالتوں کی نگرانی اس کی ذمہ داری تھی۔ مسلمانوں نے جو عدالتی نظام قائم کیا تھا۔ اس میں کافی عرصے تک کوئی مرکزی نظام نہ تھا۔ چنانچہ ایک علاقے کا قاضی ایک قسم کا فیصلہ دیتا تھا، تو دوسرے علاقے کے قاضی کا فیصلہ اس سے قدرے مختلف ہوتا تھا، اس تضاد کی وجہ سے بعض اوقات بڑی ناخوشگوار صورتِ حالات پیدا ہو جاتی تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں جب اس کمی کو محسوس کیا گیا اور ان کی حکومت میں عجمی اثر و رسوخ کی زیادتی کی وجہ سے، انہیں ایران کی عدالتِ عالیہ (یعنی موبذِ موبذان) کا علم ہوا، تو مسلمانوں نے بھی اسی طرز پر قاضی القضاۃ کا ایک علیحدہ عہدہ قائم کیا۔ جو عام طور پر ایک وزیر کے برابر ہوتا تھا اور اس کا کام مختلف عدالتوں کی نگرانی ہوتی تھی، عباسی دَور میں اس کے بارے میں متعلقہ تفصیلات پیش کی جائیں گی۔ بہرحال اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بغض سے کام نہ لیا، انہیں جہاں کوئی اچھی چیز مل جاتی تھی، وہ اسے اختیار کر لیتے تھے، اور یہی کچھ عدالتی نظام کے سلسلے میں کیا گیا۔

دوسرا باب

اسلام کا سیاسی نظام

کسی مملکت کا عدالتی نظام اس کے سیاسی نظام کے تابع ہوتا ہے۔ اس لئے اس مملکت کے عدالتی نظام کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کے سیاسی نظام سے واقفیت کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان نے جب سے اس کرۂ ارض پر مل جل کر رہنا شروع کیا ہے، تو اس کے نتیجے میں کئی نظام حکومت وجود میں آئے۔ ابتدائی دور میں جو نظامِ حکومت وجود میں آئے۔ ان میں بادشاہ کو خدا کا درجہ دیا جاتا تھا۔ بعد میں اس درجے میں کچھ کمی کر دی گئی اور بادشاہ کو خدا کی بجائے دیوتاؤں کا سایہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی کہ بادشاہ کی ذات، مختلف دیوتاؤں میں سے کسی ایک دیوتا کا پرتو تسلیم کی جاتی۔ یہ بادشاہ خیال کرتے تھے کہ ان کا اقتدار انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا ہے۔ یا وہ ان دیوتاؤں کا عطیہ ہے۔ جن کا روپ انہوں نے دھار رکھا ہوتا تھا۔ اس قسم کے بادشاہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں جو احکام جاری کرتے۔ اس میں صرف ان کی اپنی خوشی اور خواہش کارفرما ہوتی، عوام کی خوشی یا ناراضگی کی انہیں ذرہ بھر پرواہ نہ ہوتی، ان کی سوچ کے مطابق عوام تو پیدا ہی اس لئے ہوئے ہوتے تھے کہ وہ بادشاہوں کے ان احکامات کی

اطاعت کریں۔ انہیں ناراض یا خوش ہونے یا رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ انسانیت کو اس قسم کے بادشاہوں اور ان کی حکومتوں کے تجربے سے کوئی آرام یا سکون نہیں ملا۔ اس لئے ہمیشہ انہیں بدلنے کی کوششیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب کبھی یہ کوششیں کامیاب ہو جاتیں تو پھر ایک بادشاہ کی بجائے چند امراء پر مشتمل حکومتیں ظہور پذیر ہو جاتیں تھیں۔ یہ امراء خود اپنے درمیان تو مساوات کے قائل تھے لیکن عوام کے لئے وہ اس کے روادار نہ تھے۔ اس کے نتیجے میں مطلق العنان ظالموں اور سفاکوں کا دورِ حکومت آیا۔ یہ مظلوم عوام کی دستگیری کے نام سے میدان میں آئے۔ اور اعلان کیا کہ وہ امراء اور سرداروں کے مظالم سے عوام کو نجات دلائیں گے اور لوگوں میں عدل و مساوات پھیلائیں گے، غریب اور امیر، طاقتور اور کمزور کا فرق مٹا دیں گے۔ لیکن یہ سب تو وہ نہ کر سکے بلکہ الٹا غریب لوگوں پر مظالم کا دائرہ پہلے سے بھی کچھ زیادہ وسیع ہو گیا۔

اس کے بعد انسانیت نے ایک ایسے نظامِ حکومت کا منہ دیکھا، جسے پہلے کی نسبت بہترین قرار دیا گیا، یہ عوام کی اپنی حکومت کا نعرہ تھا، جسے جمہوریت کا نام دیا گیا۔ بظاہر تو یہ نظامِ حکومت عوام کو اپنے معاملات کا خود مختار بنا دیتا ہے۔ انسانیت نے اس نظام کا تجربہ کیا اور بلاشبہ اس کے ذریعے اسے انصاف کی ایک قسط مل گئی۔ لیکن پوری پوری وہ بھی وصول نہ ہو سکی۔ کیونکہ لوگوں کی اکثریت عام طور پر کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہو سکتی تھی، اور وہ یک جہتی اور اشتراک سے محروم ہی رہے۔ یہ حکومت بھی عوام کے نمائندوں کے ذریعے ہوتی، جو انسانوں ہی میں سے ہوتے، ان میں سے کچھ اگر ایثار کا پیکر ہوتے،

تو خود غرضوں کی بھی کمی نہ تھی، اور یہ لوگ اکثر و بیشتر اپنے عوام کو غلط راستے پر لگا دیتے اور بالآخر نا انصافی کی وہی فضا پیدا ہو جاتی، جو خدائی حقوق کے مالک حکمرانوں، مستبد بادشاہوں اور خود غرض امراء کی حکومت کا خاصہ تھا۔ مختصر یہ کہ انسانیت جو نظام دیکھ چکی تھی، وہ یا تو خدائی حقوق کا دعویٰ کرنے والے حکمرانوں کی حکومت تھی، یا مستبد اور ظالم امراء کی حکومت اور جمہوریت بھی اس کو سکون نہ دے سکی۔ اسلامی نظامِ حکومت کو بھی عام طور پر انہی پیمانوں سے ماپنے کی کوشش کی جاتی ہے اگرچہ وہ ان سب سے بڑی حد تک مختلف ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کا تصوّر

اسلامی نظامِ حکومت کی بنیاد دینِ الٰہی پر ہے۔ اس لئے علمائے اسلام کا ایک طبقہ یہ خیال کرتا ہے کہ اسلامی حکومت کی قوت اور حکمرانی کا دار و مدار اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی غیبی امداد پر ہے۔ لوگوں کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ نہ وہ اس میں شرکت کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر اعتراض۔ پس اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے قانون اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کریں۔ بلکہ مسلمان ایماندار ہی اس وقت ہو سکتے ہیں۔ جب وہ اپنے اختلافی معاملات یا تنازعات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حَکَم بنائیں، کیونکہ اسلامی نظام کی تفصیلات آپؐ پر وحی کے ذریعے نازل کر دی گئی تھیں۔

اسلامی نظامِ حکومت کے بارے میں یہ تصوّر کہ، اس میں عوام کسی درجے میں شریک نہیں ہو سکتے صحیح نہیں ہے۔ بلا شبہ اسلام دینِ الٰہی ہے، اور اُس کے اپنے احکامات اور حدود ہیں۔ جن کا تعلق سب سے

پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید سے ہے، پھر رسالت کی تصدیق اور اس کے بعد نیک اور صالح زندگی سے ہے۔ اس طرح اس نے عام انسانوں کو ان کی دنیاوی اور اُخروی فلاح کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن اس نے ان کی آزادی کو کسی طور سلب نہیں کیا، اور نہ ہی ان کے ارادوں کو معطل کیا۔ اللہ تعالےٰ نے تو ایک مقرّرہ حد کے اندر انہیں مختار بنایا ہے۔ انہیں نیکی اور بُرائی دونوں کے راستے دکھا دیئے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں عقل اور دل کی قوّت عطا کی تاکہ اس کے ذریعے وہ غور و فکر کریں اور نیکی اور برائی میں سے جو راستہ چاہیں اختیار کریں۔

اسلام میں شوریٰ کا تصوّر

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کریں۔ اگر اسلامی نظام کی تمام کی تمام تفصیلات وحیِ آسمانی پر مشتمل ہوتیں تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورے کی کیا ضرورت تھی جبکہ خود ارشادِ خداوندی کے مطابق انہیں ایسا کرنے کی ہدایت کی گئی۔

ارشادِ ربّانی ہے:-

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۔ [1]

(ترجمہ) اور معاملات میں ان سے مشورہ کیجیے۔

اس امر کی کئی مثالیں موجود ہیں کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک رائے ہوتی تھی جبکہ بعض صحابہ کرام کی دوسری۔ اور آپؐ

---

[1] سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۵۹۔

نے اپنی رائے کو ترک کر کے صحابہ کرام کی رائے پر عمل کیا۔ مثلاً غزوۂ بدر میں آپؐ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا مشورہ قبول فرما لیا تھا۔ آپؐ انہیں ایک مقام پر ٹھہرانا چاہتے تھے تو بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ کیا اس مقام کا انتخاب حکمِ الٰہی کے تحت ہے یا اس میں کوئی مصلحت ہے، تو آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ یہ خدا کا حکم نہیں ہے۔ اس پر آپؐ کو مشورہ دیا گیا کہ یہ مقام جنگی نقطۂ نظر سے مناسب نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو یہاں سے ہٹا کر پانی کے قریب کسی جگہ جمنے کا حکم دیا جائے۔

اسی طرح جنگِ احد کے موقع پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے آنے کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی بجائے مدینہ منوّرہ میں ہی بیٹھ کر کفّار کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس صحابہ کرامؓ نے مشورہ دیا کہ دشمن کے مقابلے کے لئے مدینہ منوّرہ سے باہر نکلنا ضروری ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اُن کی بات مان لی، اور دشمن کے مقابلے کے لئے مدینہ شریف سے باہر نکل کھڑے ہوئے۔

یہاں مزید مثالیں بیان کرنے کی گنجائش نہیں اور ہمارے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے یہ چند ہی کافی ہیں کہ عہدِ نبویؐ میں جب احکام کا نزول ہوتا تھا تو ان میں چھوٹی چھوٹی تفصیلات بیان نہیں ہوتی تھیں۔ وحیٔ خداوندی کا نزول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو عام اور خاص مصالح کی طرف متوجہ کر دیتا تھا، اور وہ باہمی مشورے کے ساتھ بھلائی اور انصاف کی حدود میں اپنے معاملات کے لئے اپنی مرضی کے مطابق تدبیریں کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں ہر ایک کو اپنے خیالات پیش کرنے کی آزادی

تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے سیاسی نظام کا کوئی مفصل ڈھانچہ پیش نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس اس نے کچھ حدود مقرر کر دی ہیں، اور پھر مسلمانوں کو کامل آزادی دی ہے، کہ وہ ان حدود کے اندر رہ کر اور اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں اپنے لئے مناسب نظامِ حکومت مرتب کریں۔

اسلام اور ملوکیت

خلافتِ راشدہ کے بعد عالمِ اسلامی پہ عملاً ملوکیت چھا گئی تھی، اور اسلام کا اکثر علمی سرمایہ اسی دور میں مرتب ہوا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کے لئے جواز تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ بعض اہلِ علم نے دورِ رسالت و خلافت کے نظامِ حکومت کو ایک انفرادی شاہی عادلانہ نظام سے تشبیہ دی۔ جس میں صحابہ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین کے ساتھ شریکِ حکومت نہ تھے، بلکہ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ مشیروں کی تھی، اور یہ مشیر بھی لازمی اور ضروری نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء عدل کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے سوا کوئی بات ان کی نگاہوں میں اہم نہ تھی۔ اس قسم کا تخیّل مسلمانوں کے نظامِ حکومت کو اس طرزِ حکومت کے قریب کر دیتا ہے، جو رومیوں میں شاہی اور قیصری دور میں تھا۔ اسی دلیل کا سہارا لیتے ہوئے اسلام میں ملوکیت کا جواز نکالا گیا۔ حالانکہ روم کے بادشاہ بھی بطورِ وارث حکومت کے قطعی حقدار نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کا باقاعدہ انتخاب ہوتا تھا۔ ہاں جب کوئی ایک مرتبہ منتخب ہو جاتا تو پھر وہ عمر بھر حکومت کرتا۔ البتہ شدید بغاوت یا عام نافرمانی کی حالت میں اسے معزول ہونا پڑتا۔ ملوکیت کا

جواز پیش کرنے والے یہ وضاحت ضرور کرتے ہیں کہ عہدِ نبوی ﷺ اور خلفائے راشدین کے اسلامی نظام میں ایک بنیادی فرق ضرور ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی حکومت کا قوام، عدل وانصاف تھا، جبکہ رومی بادشاہوں اور قیصروں کا دربار اس سے یکسر وبیشتر خالی تھا، لیکن یہ خیال بھی دقتِ نظر پر مبنی نہیں۔

اہلِ رُوم کی وہ ترقی، جس نے رُومی عوام کو ان کے ابتدائی اور سادہ زندگی سے نکال کر ایک پُر تکلّف اور پیچیدہ نظامِ حیات سے آشنا کیا، اس ارتقاء سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ جس نے عربوں کو ان کے دورِ جاہلیّت سے کھینچ کر اسلام تک پہنچایا تھا۔ رُومی انقلاب ایک مادی انقلاب تھا۔ جو تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ تدریجی طور پر ظہور پذیر ہوا۔ خارجی حالات نے پلٹا کھایا، تو رومیوں کی خارجی زندگیوں میں انقلاب آگیا۔ یعنی اس نے باہر سے اثر انداز ہو کر ان کی طبیعتوں کو بدل ڈالا۔ جبکہ اسلامی انقلاب ایک معنوی انقلاب تھا۔ جس کی تبدیلی طبیعتوں کی تبدیلی تھی۔ جو عربوں میں اسلام کی تاثیر سے ہوئی۔ پس کہنا چاہیئے کہ اسلامی انقلاب، رُومی انقلاب کے بالکل برعکس اندر سے باہر آیا۔ طبیعتیں بدلیں اور عربوں نے اپنی زندگی کا مادی نقشہ بدلا ہوا پایا۔ مسلمانوں کی حکومت دینِ الٰہی کی مقررہ حدود کی پابند تھی۔ جبکہ بادشاہ چاہے وہ کتنے ہی عادل کیوں نہ ہوتے، اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے ایسے ایسے اقدامات کرتے کہ آج بھی انسانیت ان سے شرماتی ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام کے نظامِ حکومت کو شخصی بادشاہت سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

اسلامی جمہوریت | موجودہ دَور کے کچھ اہلِ علم کا خیال ہے کہ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا دورِ حکومت جمہوریت سے مشابہ تھا۔ اور اسی سے استدلال کرتے ہوئے آج اسلامی جمہوریت کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ لیکن یہ استدلال زمانۂ جدید کی اس اصطلاح کو اس کی مقرّرہ حدود سے آگے بڑھا دیتا ہے۔ اس نظام کے لئے جمہوری یا غیر جمہوری کا حکم لگانے سے پہلے ہمیں پوری باریکی کے ساتھ خود جمہوریت کا مفہوم مقرر کرنا ہوگا۔

جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے جو خود عوام نے عوام کے لئے قائم کی ہو۔ جس کے حاکم کا انتخاب عوام نے اپنے آزاد اختیار سے کیا ہو، اور اس میں حاکم کے آزاد احتساب اور نگرانی کا حق، عوام کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ معلوم کرسکیں کہ ان کا حاکم جمہوری مصلحتوں کے لئے کام کر رہا ہے یا ذاتی مصلحتوں کو فوقیت دے رہا ہے۔ پھر یہ کہ اگر وہ مطمئن نہ ہوں تو اسے معزول کرسکیں۔ یونانی عہدِ قدیم میں جمہوریت کا یہی مطلب سمجھتے تھے، اور آج اِس زمانۂ جدید میں بھی جن قوموں نے جمہوری نظام اپنایا ہے۔ وہ بھی اس کا یہی مطلب لیتے ہیں۔ ہاں لفظ عوام کے مفہوم میں اختلاف رہا ہے۔ اس لفظ کے مفہوم کا دائرہ یونانیوں کے عہد میں تنگ تھا، اس سے وہ اپنے ہم وطنوں کی ایک خاص مختصر جماعت مراد لیتے تھے۔ جس کے افراد تمام حقوق کے مالک ہوتے اور قانون کی نگاہ میں باہم مساوی ہوتے تھے، لیکن عام انسانوں کا نہ مساوات میں کچھ حصّہ تھا اور نہ حکومت میں۔ یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد اس لفظ میں کچھ وسعت پیدا کی گئی۔ جس کے نتیجے میں اس کے دائرے میں اہلِ وطن کی بڑی تعداد داخل ہوگئی۔ جیسے سیاسی

حقوق سے استفادے کا حق دیا گیا۔ لیکن یہ وسعت بھی تمام اہلِ وطن کو اپنے اندر شامل نہ کر سکی۔ اس لئے کہ عوام کے مفہوم میں اب تک اس قید کی تنگی تھی کہ وہ یا تو ایک مقررہ معیار کے دولت مند ہوں یا ٹیکس کی ایک مقررہ مقدار ادا کرتے ہوں۔ یا تعلیم و تہذیب میں کوئی خاص درجہ رکھتے ہوں۔

ملکِ عزیز میں قیامِ پاکستان کے بعد ہی وطن کے تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو ووٹ کا حق دے کر جمہوریت کا دامن پوری طرح وسیع کر دیا گیا۔ بہر حال جمہوریت خواہ محدود ہو یا کشادہ وہ اپنا ایک مقررہ نظام رکھتی ہے۔ وہ نظام عوام کو حقوق کا مالک بناتا ہے، اور انہیں اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں پر احتساب کی نظر رکھیں۔ اگر ہم اس مثالی جمہوریت کی ان تفصیلات کو سامنے رکھیں تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائی اسلامی دَور میں اس قسم کا جمہوری نظام نہیں تھا، اور نہ ہی عوام نے اس طریقے کے مطابق اپنے حکمرانوں کا انتخاب کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عوام نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تبلیغ کرنے اور عدل و انصاف کرنے کے لئے منتخب نہیں کیا تھا۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنا رسول بنا کر انسانوں کی طرف بھیجا تھا۔ پھر جس کا جی چاہا ایمان لایا، اور جس کا جی چاہا مخالفت کرتا رہا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے صحابہ کرام نے آپؐ کو اپنا حاکم پسند کیا تو یہ پسندیدگی بھی جمہوری نظام کی شرائط کے مطابق نہ تھی، اور نہ ہی صحابہ کرام آپؐ پر احتساب یا نگرانی رکھتے تھے۔ وہاں تو حالت یہ تھی کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان

سے مشورہ طلب فرماتے تھے تو صحابہ کرام اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے تھے، اگرچہ آپؐ کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ آپؐ لازماً ان کے مشورے کو قبول کرنے کے پابند ہوں۔ لیکن آپؐ نے عام طور پر ان کے مشورے کو قبول فرمایا۔ اسی طرح خلفائے راشدین کو بھی تمام مسلمانوں نے موجودہ جمہوری نظام کی شرائط کے مطابق منتخب نہیں کیا تھا۔ انصار و مہاجرین کے ارباب حل وعقد کی ایک جماعت نے اپنے ابتدائی اختلافات کے باوجود انہیں خلیفۂ رسول منتخب کیا۔ اس سلسلے میں ان مسلمانوں سے تو کوئی مشورہ ہی نہیں لیا گیا تھا۔ جو مختلف مفتوحہ ممالک سے نقلِ مکانی کر کے مکہ مکرّمہ، طائف اور ان شہروں کے قرب وجوار کے دیہات میں آباد تھے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ جب ان مسلمانوں نے مدینہ منوّرہ والوں کی یہ پسند دیکھی تو انہوں نے بھی اسے خوش دلی سے تسلیم کر لیا۔

پھر انصار و مہاجرین کی یہ جماعت کوئی ایسا مقررہ نظام نہیں رکھتی تھی۔ جس سے خلفاء کی کارروائیوں پر احتساب کیا جا سکے۔ اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر باز پُرس ہو سکے۔ اس وقت عملی صورت یہ تھی کہ خلفائے راشدین اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے اور یہ ساتھی کبھی انفرادی حیثیت میں اور کبھی اجتماعی طور پر اپنے خیالات کا اظہار فرما دیتے اور خلفاء چاہتے تو انہیں اختیار کر لیتے یا رَد فرما دیتے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اوّلین اسلامی دَور کا نظامِ حکومت اس طرح کا جمہوری نہ تھا جس کی تفصیلات موجودہ زمانے میں ملتی ہیں، تاہم موجودہ جمہوری نظام کو اسلام کے شورمی

کے ادارے کی مدد سے اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔

اسلامی نظام کی بنیاد توحید اور مساوات

اسلام نے دنیا کے سامنے سب سے پہلے دو باتیں پیش کیں۔ ایک توحیدِ الٰہی اور دوسری مساواتِ انسانی۔

ارشادِ ربّانی ہے :-

إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ [1]

(ترجمہ) ہم نے تمہیں نر اور مادہ سے پیدا کیا اور پہچان کے لئے تمہیں قبیلوں اور شعوب یعنی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

قریش کو سب سے زیادہ غصہ آپؐ کی اُس دعوت پر تھا، جس کی بنیاد عدل اور مساوات پر تھی۔ جس کے مطابق حاکم اور محکوم، آزاد اور غلام، طاقتور اور کمزور، امیر اور غریب کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا اور سب کنگھی کے دانتوں کی طرح برابر تھے۔ آپؐ ہمیشہ لوگوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ آپس میں اُونچ نیچ کا برتاؤ نہ کریں۔ شاید کسی کے دل میں یہ خیال

---

[1] سورۃ الحجرات :- ۱۳ —

پیدا ہو کہ آپ نے غلامی کا خاتمہ نہیں فرمایا۔ دراصل یہ خیال ان کے اسلام کو اچھی طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوگا۔ ورنہ عرب کے غلام زدہ معاشرے میں خدا کے دربار میں آقا و غلام کا درجہ یک قلم بڑھا کر برابر کر دینا اسلام کا وہ اقدام ہے جو انسانیت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے غلامی کا خاتمہ کر دیا، اور معاشرے میں موجود غلاموں کو اسی معاشرے کا فرد بنانے کے لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اقدامات فرمائے۔ اگر بعد میں پیش آنے والے بعض واقعات فتنہ و فساد بن کر مسلمانوں کی راہ میں حائل نہ ہو گئے ہوتے اور مسلمانوں کے معاملات اپنے رُخ پر چلتے رہتے تو غلامی ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے صفحۂ ارضی سے نیست و نابود ہو جاتی۔

یہی وہ تعلیمات تھیں، جن کو سُن کر قریش آگ بگولا ہو جاتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غصّے سے دانت پیستے تھے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر قریش کو توحید کے اس محدود تصوّر کی دعوت دی جاتی۔ جو ان کے ذہنوں میں تھا اور ان کے سماجی اور اقتصادی نظام کو نہ چھیڑا جاتا، تو ان کی بڑی اکثریت بڑی آسانی کے ساتھ ایمان لے آتی۔ اس لیئے کہ قریش کے لوگ تو اپنے بتوں کے ساتھ بھی مخلصانہ عقیدت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں ان کی کیفیت تذبذب کی سی تھی، اور وہ بھی شوخی و تمسخر کے انداز میں۔ یہ سارے بت ان کی نگاہ میں اصل میں مقصود نہ تھے۔ بلکہ عام عربوں کو قابو میں رکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ تھے۔ پھر اگر قریش کی بڑی اکثریت ایمان نہ لاتی، تو جو بھی ایمان لاتے، لاتے، جو نہ لاتے وہ رُکے رہتے،

لیکن آپ کے لئے کسی آویزش یا عناد کا باعث نہ بنتے۔ قریش کا غیظ و غضب جس قدر بتوں کی مذمت سے تھا، اس سے کہیں زیادہ اس بات پر تھا کہ آپ کی تعلیمات سے ان کا سماجی نظام ہلنے لگا، اور آپ ایک ایسے انصاف کی دعوت دیتے تھے جو ان کی سیادت و قیادت کے مفاد کے خلاف تھا۔ مختصر یہ کہ توحید کے ساتھ انسانی مساوات کا سبق سب سے پہلے اسلامی نظام نے دیا اور یہ سبق صرف الفاظ کی حد تک نہیں تھا۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا، اور یہ اسی مساوات ہی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی معاشرے میں تنازعات بڑی حد تک کم ہو گئے، چنانچہ اگلے باب میں ہم اس کی کچھ مزید تفصیلات سامنے لائیں گے۔

تیسرا باب

اسلام کے عدالتی نظام کے لئے

مُعاشرے کی تیّاری

اسلام اپنے عدالتی نظام کے نفاذ سے پہلے ایک خاص قسم کا معاشرہ تیّار کرتا ہے کہ جس میں جرائم اور تنازعات کی شرح خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ ہمارا موجودہ معاشرہ چونکہ ان اسلامی تعلیمات سے بہت دُور جا چکا ہے۔ اس لئے جرائم کی کثرت نے اسے تباہی کے گڑھے پر پہنچا دیا ہے۔ آجکل ہماری مختلف عدالتوں میں جو لاکھوں مقدمات زیرِ سماعت ہیں ان میں سے اَسّی نوّے فیصد مقدمات کا کسی نہ کسی صورت میں زمین کی ملکیّت یا کسی دوسرے تنازعے سے تعلق ہو گا۔ لیکن اسلام میں اس ملکیّت کا تصوّر یکسر مختلف ہے کہ جس کی وجہ سے اس قسم کے مقدمات کی نوبت ہی نہ آئے گی۔

زمین کی شرعی حیثیت

قرآن حکیم کے مطابق اسلام میں سب سے بڑا جرم ربٰوا یعنی سودی کاروبار ہے۔ اس کاروبار کو اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اسلام میں اس سے زیادہ سنگین جُرم کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ جس معاملے میں سود کا

معمولی شائبہ بھی پایا جائے اسے بھی ترک کر دیا جائے۔ [1]

خیال رہے کہ آجکل ہم سود کی حرمت کو صرف بینکوں تک محدود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دورِ رسالت میں ان اداروں کا وجود تک نہ تھا۔ چنانچہ جب سود کی حرمت کے احکامات نازل ہوئے، تو آپ مختلف کاروباری معاملات کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے منڈیوں اور کھیتوں میں تشریف لے گئے۔ آپ ایک کھیت کے پاس سے گزرے تو حضرت رافع بن خدیج رض اسے پانی دے رہے تھے۔ آپ نے ان سے کھیتی باڑی کے معاملات کی تفصیل دریافت فرمائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ زمین فلاں شخص کی ہے، اور وہ اس پر کاشت کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ سود کا معاملہ کر رہے ہو۔ جو شریعتِ اسلامی نے حرام قرار دے دیا ہے، اس لئے ایسے معاملات ختم کر دو۔ [2]

امام ابوداؤد نے اس سلسلے میں ایک دوسری حدیث بیان فرمائی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے بٹائی کے مروجہ نظام کے لئے حرمت کے وہی الفاظ بیان فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سود کے لئے فرمائے ہیں ملاحظہ ہوں :-

عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من لم

---

[1] کنز الاعمال جلد دوم صفحہ ۲۳۱ مطبوعہ حیدر آباد دکن۔

[2] سنن ابوداؤد جلد سوم مطبوعہ مصر صفحہ ۳۵۵

يَذَرِ الْمُخَابَرَةَ فَلْيَأْذَنْ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔ ۳ھ

(ترجمہ) حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص زمین کی بٹائی کے معاملے کو چھوڑنے پر تیار نہیں وہ اللہ اور اس کے رسول یعنی اسلامی نظام حکومت کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہوئے۔

مدینہ منورہ زرعی علاقہ تھا۔ اور بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے پاس اپنی کاشت سے زائد زمینیں تھیں۔ جو وہ دوسرے کاشت کاروں کو بٹائی کے اصول پر دیا کرتے تھے اور پیداوار کا ایک مقررہ حصہ ان سے لے لیتے تھے۔ بٹائی کے معاملے کی حرمت کے بعد سوال پیدا ہوا کہ ان زائد اراضی کو کیا کیا جائے۔ بظاہر ایک ہی صورت سامنے تھی کہ انہیں بیچ دیا جائے۔ لیکن اس مقصد کے لئے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنا ضروری سمجھا۔ جب اس بارے میں آپؐ سے دریافت کیا گیا تو آپؐ نے اس زائد زمین کو فروخت کرنے کی اجازت نہ دی۔ بلکہ فرمایا کہ یہ زائد اراضی اپنے کسی بھائی کو مفت دے دو۔ ایسا کرنا سب لوگوں کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آپؐ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ امام بخاری

۳ھ سنن ابوداؤد، جلد سوم، مطبوعہ مصر، صفحہ ۲۵۵

اور امام مسلم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی زبانی ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے :-

کان لرجالٍ من اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من فضول ارضین ۔ فقال رسول اللّٰہ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام من کان لہٗ ارض فلیزرعھا او یمنحھا اخاہ فان ابی فلیمسک ارضہٗ ۔ ؎۴

(ترجمہ) بعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فاضل اراضی تھیں ۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو بخش دے ۔ اور اگر یہ اسے قبول نہ ہو تو پھر اپنی زمین روک رکھے ۔

عربی کے جن الفاظ کا ترجمہ "روک رکھے" کیا گیا ہے ، ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زائد اراضی کے مالک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے بار بار اس مسئلے کے بارے میں سوال کیا ۔ اور آپؐ نے ہر دفعہ نفی میں جواب دیا اور زائد زمین بیچنے کی مطلق اجازت نہ دی ۔ بلکہ ایک دوسرے موقع پر انہیں شریعت اسلامیہ کا یہ حکم بھی سنا دیا کہ جو شخص بغیر آبادکاری کے تین سال تک زمین کو کاشت کئے بغیر خالی چھوڑے رکھے گا ، اس پر اس کے حقوقِ ملکیت ختم ہو جائیں گے ، اور وہ زمین

؎۴ نیل الاوطار مطبوعہ مصر تالیف علامہ شوکانی جلد پنجم صفحہ ۲۹۵ ۔

اسلامی ریاست کی ملکیّت بن جائے گی جو کاشت کے لئے دوسرے مسلمانوں کے حوالے کرے گی۔ ؎۵

یہ حکم تو عرب کی خالص اراضی کے بارے میں تھا، جن پر شریعت اسلامی کے مطابق عشر عائد ہوتا تھا۔ لیکن اسلامی قانون میں اراضی کی ایک دوسری قسم بھی ہے جسے خراجی کہتے ہیں اور پاکستان سمیت تمام مفتوحہ ممالک کی زمینیں اس کے ذیل میں آتی ہیں۔

عراق اور ایران کی فتح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ تمام اراضی اسلامی بیت المال کی ملکیّت میں رہے گی، کوئی فرد یا حکومت ان کی مالک نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ صدیوں تک برصغیر ہند و پاکستان سمیت تمام مفتوحہ ممالک میں مسلمان اسی پر عمل کرتے رہے۔ علامہ ثناء اللہ پانی پتی نے جب فقہ پر اپنی مشہور کتاب "مالابد" تصنیف فرمائی تو انہوں نے اس اہم مسئلہ کو صرف آدھی سطر میں واضح فرما دیا تھا کہ چونکہ برصغیر ہند و پاکستان میں کوئی عشری زمین نہیں، اس لئے یہاں عشر کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں کی اراضی خراجی ہیں۔

مولانا محمد حفیظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب نے اپنی مشہور کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" میں تو یہاں تک تحریر فرمایا ہے کہ شروع شروع میں انگریز بھی اس اسلامی قانون کا لحاظ کرتے ہوئے اراضی ہند کو زمیندار یا تعلقہ دار کی ملکیّت نہیں

؎۵ کتاب الاموال لابی عبید مطبوعہ مصر صفحہ ۹۰

سمجھنے تھے۔ [۵۶]

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ملکِ عزیز میں اسّی نوّے فیصد مقدمات کا تعلق ملکیّت زمین سے متعلق تنازعات سے ہے اور اسلامی قانون کی رُو سے ہماری زمین اسلامی بیت المال کی ملکیّت قرار پاتی ہے۔ تو اسلامی قانون کے نفاذ کے بعد ان اسّی نوّے فیصد مقدمات کا سرے سے وجود ہی باقی نہ رہے گا۔ جس سے اسلام کا عدالتی نظام اپنی سادہ شکل میں سامنے آجائے گا۔

ضرورت سے زائد دولت

مروّجہ قانونی اصطلاحات کے مطابق بقیّہ پندرہ بیس فیصد مقدمات کا تعلق زن (عورت) اور زر (دولت) سے ہے، جنہیں دوسرے الفاظ میں مال و دولت اور عائلی زندگی کے تنازعات کہا جاتا ہے۔ مال و دولت کے بارے میں بھی اسلام نے جو اصولی احکامات دیئے ہیں ان پر عمل کرنے کے بعد اس شق کے بھی بہت سے مقدمات خودبخود ختم ہو جائیں گے۔ ہمارے ہاں جو سرمایہ داری نظام کے تحت دولت سمیٹنے کا رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ اسلامی تعلیمات اس کے تصوّر تک سے ناآشنا ہیں۔ اس بارے میں قرآن حکیم میں کئی واضح احکامات موجود ہیں کہ جن میں دولت جمع کرنے سے منع کیا گیا اختصار کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان آیات کی تشریح و تفسیر اپنی جانب سے پیش کرنے کی بجائے ہم برّصغیر کے ایک معروف عالمِ دین

---

[۵۶] اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ ۴۰۲

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی تشریح نقل کرتے ہیں۔ آپ کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ برصغیر کے سب مسلمان آپ کی عزت کرتے تھے۔ آپ آیت خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"جملہ اشیائے عالم، بدلیلِ فرمانِ واجب الاذعان، خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہے۔ یعنی غرضِ خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس (انسان) ہے اور کوئی شی فی حدِ ذاتہٖ کسی کی مملوک نہیں۔ بلکہ ہر شے اصل خلقت میں جملہ ناس میں مشترک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے۔ ہاں بوجہ رفع نزاع وحصولِ انتفاع قبضہ کو علتِ ملک مقرر کیا گیا اور جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضۂ تامہ مستقلہ باقی رہے، اس وقت تک کوئی دوسرا اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔ ہاں خود مالک وقابض کو چاہیئے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے۔ بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کر دے۔ کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مالِ کثیر حاجت سے زائد رکھنا بہتر نہ ہوا۔ گو زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے اور انبیاء وصلحاء اس سے بغایت مجتنب رہے۔"

"چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض صحابہ رضؓ و تابعینؒ وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام فرما دیا۔ بہرکیف غیر مناسب"

خلاف اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زائد علی الحاجت سے اس کی تو کوئی غرض نہیں اور اوروں کی ملک من وجہٍ اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور من وجہٍ مالِ غیر قابض و متصرف ہے اور اس کا حال بعینہٖ مالِ غنیمت کا سا تصوّر کرنا چاہیئے۔ وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصّہ ہے کہ کل مالِ غنیمت تمام مجاہدوں کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت وحصولِ انتفاع بقدر حاجت ہر کوئی مالِ مذکور سے متمتع ہو سکتا ہے۔ ہاں حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے۔ اس کا حال آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیئے یعنی خائن شمار ہو گا۔“ ؎

سلف صالحین کے اس مسلک کی روشنی میں عام مسلمانوں سے جب یہ توقع بھی نہ تھی کہ وہ اپنی محنت و دیانت سے حاصل کردہ زائد مال پر قبضہ جمائے رکھیں، تو ان سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی تھی، کہ وہ دوسروں کے مال و اموال پر ناجائز تصرّف کریں۔ اس کے برعکس ہمارے موجودہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں جس کی بنیاد سود پر اٹھائی جاتی ہے۔ ایسی اخلاقی تعلیمات کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ ایسے معاشرے میں دولت بھی صرف اسی وقت ہاتھ آتی ہے۔ جب دوسروں کے حقوق غصب کیے جائیں، اور سود ہی اس کا بڑا ذریعہ ہوتا ہے جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تنازعات

؎ ایضاح الادلۃ صفحہ ۲۶۸ بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام از مولانا سیوہاروی مطبوعہ دہلی صفحہ ۴۲۔۴۳

کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ مال و دولت کے بارے میں اسلام نے ایسی عمدہ تعلیم دی ہے کہ اس کے نتیجے میں تنازعات بہت کم ہوتے ہیں۔ دَورِ نبویؐ میں صرف معدودے چند ایسے تنازعات کا وجود ملتا ہے۔ جب کہ دورِ صدیقی جو دَورِ نبویؐ کی بہترین تصویر تھی اور اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تنازعات کے فیصلوں کے لئے قاضی مقرر کیا گیا تھا۔ ایک بھی ایسا مقدمہ، فیصلے کے لئے ان کے پاس نہیں آیا تھا۔

گھریلو تنازعات

زن، زر، زمین میں سے اب وہ تنازعات باقی رہ جاتے ہیں، جن کا تعلق زن یعنی عورت سے ہے۔ اس سلسلے کے تنازعات زیادہ تر گھریلو زندگی کی خرابیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بارے میں بھی اسلام کی تعلیمات کافی مؤثر ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے کم سے کم تنازعات وجود میں آتے ہیں۔ اسلام ایک خوشگوار معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی معاشرہ صرف اسی وقت ہی خوشگوار ہو گا جب اس کا چھوٹا یونٹ یعنی گھر خوشگوار منظر پیش کرے گا۔ عام طور پر ہمارے ہاں یہ تصوّر ہے کہ گھریلو معاملات ہر فرد کا نجی معاملہ ہے، اور حکومت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں، لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ فرد کا نجی معاملہ نہیں۔ کیونکہ اس کا اثر پورے معاشرے پر پڑتا ہے۔ اس لئے اسلامی حکمران ہمیشہ اس اہم معاملے کی طرف خصوصی توجہ دیتے رہے ہیں۔ مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جب مصر کی گورنری کا عہدہ سنبھالا تو

ہوں نے مصری معاشرے کو خوشگوار بنانے کے لئے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:-

یَا مَعْشَرَ النَّاسِ اِیَّاکُمْ وخلالاً اَرْبَعْ ۔
فَاِنَّھَا تَدْعُوْا اِلَی النَّصَبِ بَعْدَ الرَّاحَةِ۔
وَاِلَی الضِّیْقِ بَعْدَ السعۃ وَاِلَی الذِّلَّةِ
بَعْدَ الْعِزَّةِ ۔ اِیَّاکُمْ وَکَثْرَةِ الْعِیَالِ۔
وَ اِخْفَاضِ الْمَالِ وَتَضْیِیْعِ الْمَالِ وَالْقِیْلَ
بَعْدَ الْقَالَ مِنْ غَیْرِ دَرْكٍ وَلَا نَوَالٍ ۔ ؎۸

(ترجمہ) اے انسانی معاشرہ۔ چار عادات سے بچو۔ کیونکہ یہ آرام کے بعد تکلیف کی طرف لے جاتی ہیں اور فراخیٔ رزق کے بعد موجب تنگی ہوتی ہیں، اور عزت والے کو ذلیل کرتی ہیں۔ تم کثرتِ عیال سے بچو۔ گھٹیا معیارِ زندگی سے دور رہو، مال و دولت ضائع نہ کرو اور فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔"

ملاحظہ فرمائیے، ایک صحابیٔ رسولؐ حکمران بن جانے کے بعد معاشرے کو خوشگوار بنانے کے لئے عوام کو ٹھیک ٹھیک انہی باتوں کی تلقین کرتے ہیں، جن پر اس جدید زمانے میں زور دیا جاتا ہے، یعنی خاندانی بہبود کے لئے کثرتِ عیال سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ہمارے آئمہ کرام اس پہلو پر خصوصیت سے زور دیتے تھے کہ معاشرے کو ہر قیمت پر خوشگوار رکھا جائے، اور اگر خدانخواستہ کسی وقت معاشرے

؎۸ النجوم الزاہرۃ فی اخبار مصر القاہرۃ جلد اوّل صفحہ ۷۲

میں ایسا فساد پیدا ہو جائے کہ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی نئی نسل کے بدکردار ہونے کا خدشہ ہو تو انہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ ایسی صورت حالات میں مسلمانوں کو ضبط ولادت پر عمل کرنا چاہیئے۔ [۹]

ظاہر ہے کہ جب گھروں کا ماحول خوشگوار اور پُرسکون ہوگا، تو ایسے معاشرے میں گھریلو تنازعات کا وجود بھی نادر ہوگا۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اس معاشرے کی جھلک جو اسلام تیار کرتا ہے اور جس کے نتیجے میں تنازعات کی شرح خود بخود کم ہو جاتی ہے۔

---

[۹] فتاویٰ شامی مطبوعہ مصر جلد دوم۔ صفحہ ۳۸۹۔

چوتھا باب

اسلام کے عدالتی نظام کا طریق کار

اسلام کے عدالتی نظام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو ہدایات قرآن مجید میں فرمائی ہیں وہ رہتی دنیا تک مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی تعلیم یہ ہے کہ فیصلے صرف عدل سے ہی نہیں کئے جائیں بلکہ ایسے عدل سے کئے جائیں جو حسین اور خوبصورت ہو۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۔ [1]

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتے ہیں۔

لفظ 'احسان' کا لغوی مادہ حُسن ہے جس کے معنی خوبصورتی کے ہیں۔ مختصر یہ کہ اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان ایسے طریقے سے عدل کا انتظام کرے کہ جو صرف انصاف پر ہی مبنی نہ ہو بلکہ اس میں خوبصورتی بھی ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مختلف اسلامی ادوار میں جو طریقے اختیار کئے گئے، ان میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھا گیا کہ صرف عدل ہی نہ ہو بلکہ یہ عدل خوبصورت بھی ہو۔

مساواتِ انسانی پر زور اسلام کے سیاسی نظام کے سلسلے میں

---

[1] سورۃ النحل : ۹۰ ۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس کی ایک اہم بنیاد مساواتِ انسانی ہے۔ یعنی قانون کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام معاملات میں ہمیشہ اسی اصول کو سامنے رکھتے تھے۔ اور پھر امت کے لئے بھی اس کی سخت تاکید فرمائی۔ یہ ہدایات آپؐ کے مشہور خطبہ حجۃ الوداع میں عمدہ طور پر جمع کر دی گئی ہیں۔ اس خطبے کو انسانی حقوق کا ایک عالمگیر منشور سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں مختلف مواقع پر اس کے مفید مطلب حصے نقل کئے جاتے ہیں، جس سے اس عالمگیر منشور کی مکمل تصویر سامنے نہیں آتی۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سطور میں اسے لفظ بہ لفظ نقل کر دیا جائے۔ خطبہ کافی طویل ہے۔ اس لئے ہم اس کا صرف اردو ترجمہ سیرت ابن ہشام سے پیش کرتے ہیں۔

خطبہ حجۃ الوداع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:۔

"اے لوگو! میری بات غور سے سنو۔ شاید کہ میں آئندہ تم سے اس جگہ کبھی ملاقات نہ کر سکوں۔ اے لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال آپس میں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ یہانتک کہ تم اپنے پروردگار سے جا ملو۔ مثل تمہارے اس دن کی حرمت کے اور اس مہینے کی حرمت کے، اور بے شک تم اپنے پروردگار کے حضور میں حاضر ہو گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کا سوال کرے گا، اور میں سب باتیں تمہیں بتا چکا ہوں۔ پس جس شخص کے پاس کسی

کی امانت ہو، وہ اس کی امانت ادا کر دے۔ اور کوئی شخص اپنے قرضدار سے بجز اس راس المال کے سود نہ لے۔ کیونکہ سود حرام کر دیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے اور حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کا سود بھی باطل کر دیا گیا ہے، اور جس قدر خون زمانۂ جاہلیّت کے تھے، سب معاف ہیں۔ اور سب سے پہلے جو خون زمانۂ جاہلیّت کا میں معاف کرتا ہوں وہ خون ابن ربیعہ بن حرث بن عبدالمطلب کا ہے، جس کو بنی ہذیل نے قتل کیا تھا۔ پس میں اس سے زمانۂ جاہلیّت کے خون معاف کرنے کی ابتداء کرتا ہوں۔"

"اور اے لوگو! تمہارے ملک میں شیطان اپنی پرستش کیے جانے سے نااُمید ہو گیا ہے۔ یعنی ملک عرب میں، اب اس کی پرستش نہ ہو گی۔ مگر ہاں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ راضی ہو گیا ہے۔ جنہیں تم بڑے گناہوں میں شمار نہ کرو گے۔ پس تمہیں اپنے دین کی حفاظت، شیطان سے کرنی لازمی ہے۔"

"اے لوگو! حرمت والے مہینوں کو حلال کر لینا اور اس کے بدلے حلال مہینوں کو حرام کر لینا کفر ہے۔ لوگ کسی مہینے کو کسی سال (اپنی نفسانی اغراض کے لیے) حلال کر لیتے ہیں۔ اور دوسرے سال (جب کوئی ذاتی غرض نہ ہو) حرام سمجھتے ہیں، اور وہ لوگ یہ ردّ و بدل اس بنا پر

کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے جو مہینے حرام کئے ہیں ان کی گنتی پوری کرلیں ۔ اسی طرح کفار اللہ تعالےٰ کے حرام کئے ہوئے مہینے کو حلال کرلیتے ہیں اور اس کے حلال کئے ہوئے مہینے کو حرام "

" ابتدا میں جب اللہ تعالےٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ زمانہ اپنی گردش پوری کر کے پھر اسی نقطہ پر آگیا ہے ۔ اور اللہ تعالےٰ نے سال کے بارہ مہینے مقرر فرمائے ہیں۔ جن میں چار قابلِ احترام ہیں ۔ ان میں سے تین تو متواتر ہیں ۔ یعنی ذیقعد ، ذی الحج اور محرم ، اور ایک مہینہ اکیلا ہے یعنی رجب جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے "

" اور اے لوگو ! تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے اور تمہاری عورتوں کا بھی تم پر حق ہے ۔ تمہارا عورتوں پہ یہ حق ہے کہ وہ کسی غیر مرد کو اپنے قریب نہ آنے دیں اور بے حیائی کی باتوں سے بچیں ۔ پس اگر وہ ایسا کریں تو اللہ تعالےٰ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ تم انہیں اپنے سے علیحدہ سلاؤ ۔ اور ایسی سزا دو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو ۔ پھر اگر وہ اُن باتوں سے باز آجائیں تو ان کا کھانا ، کپڑا حسب حیثیت تمہارے ذمّے ہے "

" اے لوگو ! عورتوں کے ساتھ بھلائی کرو ۔ وہ تمہاری مددگار ہیں ۔ وہ اپنے واسطے کچھ اختیار نہیں رکھتیں ۔ اور

تم نے خدا کی اس امانت کو اپنی تحویل میں لیا ہے اور خدا کے کلام کے ساتھ انہیں حلال کیا ہے۔ پس اے لوگو! میرے ان احکامات کو خوب سمجھو، اور میں نے تم میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے یعنی کتاب اللہ اور اس کے نبیؐ کی سنت "۔

"اے لوگو! میری ان باتوں کو سنو اور خوب سمجھ لو، اور جان لو کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، اور سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ پس مسلمان کے مال میں سے دوسرے مسلمان کو کوئی چیز لینی حلال نہیں ہے۔ سوا اس چیز کے، جو وہ اپنی خوشی سے دے، اور تم ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے باز رہنا۔ آپؐ نے فرمایا: اے اللہ! کیا میں نے تیرے احکامات تیرے بندوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ سب حاضرین نے یک زبان ہو کر جواب دیا، حضورؐ! بے شک آپؐ نے احکاماتِ الٰہی ہم تک پہنچا دیئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! تو گواہ ہو جا"۔

مقامِ عرفات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اور ربیعہ بن اُمیہ بن خلفؓ آپؐ کے پاس کھڑے تھے۔ آپؐ ان سے فرماتے کہ تم لوگوں سے کہو کہ اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ یہ کونسا مہینہ ہے۔ ربیعہ لوگوں سے کہتے کہ یہ مہینہ حرام یعنی حرمت والا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ربیعہ سے فرماتے کہ

ان سے کہہ دو کہ بے شک خدا نے تمہارے مال ایک دوسرے پر حرام کر دیئے ہیں۔ جب تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو، اور یہ مال اس مہینے کی حرمت کی طرح تم پر حرام ہیں۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ربیعہ رضی اللہ عنہ سے فرماتے کہ لوگوں سے کہو: اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم جانتے ہو یہ کونسا شہر ہے؟ ربیعہؓ لوگوں میں آواز دیتے۔ لوگ کہتے یہ شہر بلد الحرام ہے۔ حضورؐ ربیعہؓ سے فرماتے کہ ان سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے خون اور تمہارے مال ایک دوسرے پر حرام کیے ہیں۔ مثل اس شہر کی حرمت کے۔ یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو۔

پھر حضورؐ ربیعہؓ سے فرماتے کہ کہہ دو، اے لوگو! رسول اللہؐ فرماتے ہیں یہ کونسا دن ہے۔ ربیعہؓ لوگوں سے یہ دریافت کرتے تو لوگ جواب دیتے کہ یہ حج اکبر کا دن ہے۔ حضورؐ ربیعہؓ سے فرماتے کہ کہہ دو، اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے مال اور یہ خون ایک دوسرے پر حرام کئے ہیں، مثل اس دن کی حرمت کے۔ یہانتک کہ تم اپنے پروردگار سے جا ملو۔

(سیرت ابن ہشام باب خطبہ حجۃ الوداع۔ اردو ترجمہ شائع کردہ مقبول اکیڈیمی لاہور)

اس عظیم خطبے کو اس لئے من وعن نقل کر دیا گیا ہے کہ اس میں مساواتِ انسانی پر زور دے کر تنازعات کی بنیادیں ہی ختم کر دی گئیں اور جن تنازعات کا وجود میں آنے کا امکان تھا۔ اس بارے میں ایسی

ہدایات دی گئیں کہ ان کا جلد تصفیہ ہو سکے۔

تقویٰ اور فوری فیصلے

اسلامی ریاست کے عدالتی نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے مسلمانوں میں تقویٰ کی صفت لازمی قرار دی گئی۔ اور اس تقویٰ کا یہ تقاضا تھا کہ دوست اور دشمن دونوں کے درمیان عدل و انصاف سے کام لیا جائے۔ ارشادِ ربّانی ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ [1]

(ترجمہ) کسی فریق کا بغض تمہیں ناانصافی کرنے پر آمادہ نہ کرے۔ بلکہ ہر حال میں عدل کرنا چاہیئے، جو تقوے کا تقاضا ہے۔

اب اگر تقویٰ کا وہ مفہوم سامنے رکھا جائے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے منقول ہے کہ جب حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت عمرؓ سے تقویٰ کے معنی دریافت کیئے تو آپ نے فرمایا:۔

اَمَا ذَا سَلَكْتَ طَرِيْقًا ذَا شَوْكٍ۔

کیا آپ کانٹوں والے راستے پر کبھی نہیں چلے۔

آپؓ نے اثبات میں جواب دیا۔

حضرت عمرؓ نے دوبارہ پوچھا کہ فَمَا فَعَلْتَ۔ آپ نے اس راستے پر کیا کیا؟۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا شَمَّرْتُ وَاجْتَهَدْتُ

---

[1] سورۃ المائدہ : ۸

کریں نے اپنے کپڑے اکٹھے کر لئے اور کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہی تقویٰ ہے۔ یعنی ہر قسم کی برائی سے بچ کر نکلنے کی کوشش۔ چنانچہ جب اسلامی ریاست کے باشندوں میں اس قسم کا تقویٰ رچ بس جائے۔ تو پھر دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی بجائے، ہر ایک اپنی نجات کی فکر میں لگ جاتا ہے۔

شرعی فیصلے پر خود عمل کرنا

ان اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی وجہ سے، جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، مسلمانوں میں بہت کم تنازعات پیدا ہوتے تھے۔ اور جو پیدا ہوتے تھے انہیں وہ تین طرح سے نمٹاتے تھے۔ سب سے پہلے وہ اس متنازعہ معاملے کے بارے میں خود شرعی حکم معلوم کرتے۔ اور تنازعہ کے فریقین کی طرف براہِ راست اشارہ کرنے کی بجائے اس کے بارے میں شرعی فیصلہ دریافت کیا جاتا۔ یہی وہ طریقہ تھا جو اسلامی عبادات کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ پھر جب اس تنازعے کے بارے میں شریعتِ اسلامیہ کا نقطۂ نظر معلوم ہو جاتا تو فریقین اس پر خاموشی سے عمل کر لیتے تھے۔ آج بھی اس گئے گزرے دَور میں ایسے صالح مسلمانوں کی کمی نہیں جو اپنے تنازعات ختم کرنے کے لئے اس اسلامی طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ اور حکومت کی قائم کردہ عدالتوں کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

چونکہ صدرِ اسلام میں زیادہ تر تنازعات کے فیصلے مذکورہ بالا اصول کے مطابق ہوتے تھے۔ اس لئے مفتی اور قاضی کے عہدوں

میں بہت کم فرق تھا۔ بلکہ بعض اوقات یہ دونوں ذمّہ داریاں ایک ہی شخص کو سونپ دی جاتیں۔ عملاً مفتی کا عہدہ زیادہ ذمہ داری کا حامل تھا۔ اور مفتی کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ قرآن مجید اور احادیثِ نبوی ؐ کا مکمل علم رکھتا ہو۔ بلکہ اس کے لئے مجتہد ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس قاضی کے عہدے کے لئے زیادہ احتیاط نہیں کی جاتی تھی اور بعض اوقات ایسے شخص کو بھی قاضی بنا دیا جاتا تھا، جو بالکل جاہل اور اَن پڑھ ہوتا۔ قاضی عام طور پر اکیلا ہی فیصلہ دے دیتا تھا۔ لیکن جن اہلِ علم سے تنازعات یا عبادات کے بارے میں فتوے پوچھے جاتے تھے۔ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہما، جنہوں نے خلافتِ راشدہ میں قاضی کے فرائض بھی سرانجام دیئے اور بطورِ مفتی لوگوں کے سوالات کے جواب دیئے، اس بارے میں یوں احتیاط فرماتے تھے:۔

انّ عمر بنَ الخطاب و عليًا وعامة خيار الصحابة كانت ترد عليهم المسائل وهم خير القرن الذين بعث فيهم النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم وكانوا يجمعون اصحاب النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم ويسألون ثمّ حينئذٍ يفتون فيها۔ ؎۲

؎۲ الموافقات از علامہ الشاطبی۔ جلد الرابع صفحہ ۱۵۲

(ترجمہ) حضرت عمر، حضرت علی اور عام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس مسائل فتویٰ کی غرض سے آتے تھے۔ اور ان کا زمانہ سب سے اچھا زمانہ تھا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں مبعوث ہوئے تھے۔ یہ ہستیاں اس مقصد کے لئے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کرتیں اور متعلقہ مسئلہ کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی جاتی اور پھر اس کی روشنی میں فتویٰ دیا جاتا۔

مختصر یہ کہ صدر اسلام میں قاضی کی نسبت مفتی کو زیادہ اہمیّت حاصل تھی اگرچہ اس کے فیصلے کے لیے کسی دنیادی حاکم کی قوّتِ تنفید کی ضرورت نہیں تھی، لیکن ان لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ موجود تھا۔ جس کی وجہ سے وہ تنازعے کے بارے میں شرعی حکم معلوم ہو جانے کے بعد خاموشی سے خود عمل کر لیتے تھے۔ بعد کے ادوار میں اور خصوصاً ہمارے زمانے میں فتویٰ کی اہمیّت اس لئے گھٹ گئی ہے، کہ اس بارے میں اس احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا جس کا سلف صالحین اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ یہی علامہ شاطبی جن کی کتاب کا ابھی حوالہ دیا گیا ہے، اپنی اسی کتاب میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ آجکل کے علماء اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے بغیر کسی مدد کے بنفسِ نفیس فتویٰ دیا ہے۔ اس لیے بعض صورتوں میں ان فتاویٰ میں خواہشاتِ نفس کا پایا جانا یقینی ہے۔ جس کی وجہ سے صورتِ حالات کچھ الٹ منظر پیش کرتی ہے۔ وہ یوں کہ صدر اسلام میں، زیادہ تر انہی فتاوی کے ذریعے شرعی حکم معلوم کر کے تنازعات کو ختم کر دیا جاتا تھا اور قاضی

کے پاس مقدمہ لے جانے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ جب کہ بعد کے ادوار میں تقویٰ کی کمی کی وجہ سے مفتیوں کی بجائے زیادہ تر قاضیوں کی طرف رجوع کیا جانے لگا۔ خیال رہے کہ بطورِ قاضی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو چار فیصلوں کی تفصیل ملتی ہے جبکہ بطورِ مفتی ان کے ہزاروں فتاویٰ موجود ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہزاروں مسائل کو، ایک علیحدہ رسالے کی صورت میں مرتب کر دیا تھا، جس کا عنوان تھا "رسالہ در مذہب فاروقِ اعظمؓ" جو آپ کی نادر تصنیف "ازالۃ الخلفاء" کا ایک حصّہ شمار ہوتا ہے۔ اور "فقہِ عمرؓ" کے عنوان سے اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

شعبۂ قضاء کا آغاز

بہرحال ان اقدامات کے باوجود بعض تنازعات میں، اختلاف کا سنگین ہونا بھی ناگزیر تھا۔ اور اس کے لئے ضروری تھا کہ تنازعے کے دونوں فریق حاضر ہو کر، اپنے اپنے دلائل پیش کریں۔ تاکہ ان کی روشنی میں اس تنازعے کا فیصلہ کیا جائے۔ اسلام کے ابتدائی دَور میں قضاء کا ادارہ اسی سادہ شکل میں تھا۔ کیونکہ تقویٰ ہی مسلمانوں کا اوڑھنا، بچھونا تھا۔ لیکن بعد میں جب تقویٰ کے معیار میں کمی ہوتی گئی، تو شعبۂ قضاء نے بھی عروج حاصل کیا اور اس کے لئے باقاعدہ بااختیار ادارے قائم کئے گئے۔

قضاء کا لغوی اور اِصطلاحی مفہوم

لغت کی کتابوں میں قضاء کے معنی کسی چیز کو قول یا فعل کے ذریعے پورا کرنا ہیں۔ لیکن شرعی اصطلاح میں اسلامی ریاست کے مقرر کردہ بااختیار ادارے کی طرف کتاب و سنت اور دوسرے شرعی

دلائل کی روشنی میں لوگوں کے تنازعات اور مقدمات کے فیصلے کرنے کا نام قضائ ہے۔ قضاء کی اس تعریف کی دلیل قرآن مجید سے یہ پیش کی جاتی ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیادیں خود انبیائے کرام علیہم السلام ہی رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے جہاں انہیں لوگوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کی ذمّہ داری سونپی جاتی تھی، وہیں ان کی ذمّہ داری میں ان لوگوں کے تنازعات کو بھی عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کرنا شامل تھا۔

ارشادِ ربّانی ہے:-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ [۳]

(ترجمہ) اے رسول! لوگوں کے درمیان ان احکامات کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل کئے ہیں۔

اسی طرح دوسرے انبیاء کرام کے بارے میں بھی قرآن مجید میں کچھ ایسے ہی احکامات ملتے ہیں:-

يٰداود انا جعلناك خليفة في الارض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله۔ ان الذين يضلون عن سبيل الله لهم عذاب شديد بما نسوا يوم الحساب ۝ [۴]

---

[۳] سورۃ المائدہ : ۴۸

[۴] سورۃ ص : ۲۶

(ترجمہ) (پھر ہم نے ان سے کہا) اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس آپ لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ عدل وانصاف کے ساتھ کریں اور فیصلہ کرنے میں اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔ وہ تجھے خدا تعالیٰ کی راہ سے بھٹکا دیں گی۔ وہ لوگ، جو اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں، انہیں سخت عذاب ملتا ہے کیونکہ وہ حساب کے دن یعنی قیامت کو بھلا بیٹھے ہیں۔

یہ ارشادِ ربّانی قضاء کی ذمہ داری کے بارے میں ایک مختصر دستاویز کی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ہر دور کے قاضی ومنصف کے لئے ایک نہایت ہی عمدہ دستور العمل ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں قضاء کے لئے کن شرائط کی ضرورت تھی اور اس مقصد کے لئے قاضی کو کن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا، کے موضوع پر قدیم اسلامی لٹریچر میں کافی تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن یہ تمام تفصیلات مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ تاہم اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک خط جو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا تھا۔ ان میں سے اکثر تفصیلات کو سمیٹے ہوئے ہے۔

قضاء کے بارے حضرت عمرؓ کا خط

علامہ ابن قیمؒ نے اپنی مشہور کتاب "اعلام الموقعین عن ربّ العالمین" کی پہلی جلد کے صفحہ ۸۵ پر اس خط کو من وعن نقل کیا ہے۔ اس خط کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:-

"فانّ القضاء فريضة محكمة اور انتہی

والسلام علیک ورحمۃ اللہ پر ہوتی ہے۔

چونکہ یہ خط خاصا طویل ہے۔ اس لئے اختصار کو مدّنظر رکھتے ہوئے صرف اس کے ترجمے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"اچھی طرح سمجھ لو کہ قضاء ایک دینی ذمّہ داری ہے جو سُنّتِ نبویؐ کے مطابق بجالانا ضروری ہے۔ جب کوئی شخص اپنا مقدمہ تمہارے پاس لائے تو کامل غور و فکر کے ساتھ اس کی باتیں سُنو، اور جب تم فریقین کی باتیں سُننے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ تو اس کا نفاذ بھی کردو۔ کیونکہ درست فیصلے کرنے کا اس وقت تک فائدہ نہیں جب تک اس فیصلے کا نفاذ نہ کیا جائے۔ تمام لوگوں کو اپنے سامنے اور اپنے انصاف میں برابر رکھو تاکہ کمزور اور غریب آدمی انصاف سے مایوس نہ ہو، اور زبردست اور طاقتور کو تم سے کسی رو رعایت کی امید نہ ہو۔ جو شخص دعوےٰ کرے، اس کے ذمّے ثبوت پہنچانا ضروری ہے، اور جو اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کی تردید کرے، اس پر اس سے قسم لینا ضروری ہے مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے، لیکن یہ ایسی صلح ہو جو حلال کو حلال رکھے اور حرام کو حرام رہنے دے۔ اس کے مقابلے میں ایسی صلح جائز نہیں جس سے حرام حلال اور حلال حرام ہو جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے حق کو ثابت کرنے کی خاطر فوری طور پہ ثبوت مہیّا نہ کر سکے، تو اسے کچھ عرصہ کی مہلت دو۔ اگر اس عرصے میں وہ ثبوت مہیّا کر دے، تو اس کا حق اسے دلا دو۔

لیکن اگر مدّت کے اختتام تک وہ ثبوت بہم نہ پہنچا سکے تو مقدمہ خارج کر دو۔ ایسا کرنے سے اتمامِ حجت ہو جائے گی۔ اور شک بھی دور ہو جائے گا۔ اگر تم نے آج کوئی فیصلہ کیا ہے لیکن مزید غور و فکر اور عقل سے کام لینے کے بعد، تمہیں وہ فیصلہ غلط معلوم ہوا اور حق بات ظاہر ہو جائے تو پہلے فیصلے سے رجوع کرنے میں تمہیں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ حق اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اسے کوئی چیز بدل نہیں سکتی اور باطل پر اصرار کرنے سے حق کی طرف رجوع کرنا بہرحال بہتر ہے۔ سب مسلمان قابلِ اعتبار ہیں، سوائے ان اشخاص کے جن کو حد کی سزا میں کوڑے لگائے گئے ہوں، یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو۔ یا جن کا نسب مشکوک ہو۔"

"جب کسی مسئلے کے بارے میں آپ کے دل میں شک و شبہ پیدا ہو اور کتاب اللہ اور سُنتِ نبویؐ میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر خوب غور و فکر کرو۔ پھر اس کی مثالوں اور نظیروں کو دیکھئے۔ اس کے بعد قیاس سے کام لیجئے۔ اور جو قیاس اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کی سنت کے زیادہ قریب ہو، اس کے مطابق فیصلہ کیجئے۔ مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت تنگ دلی کا اظہار نہ کرو۔ فریقینِ مقدمہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاؤ۔ مقدمہ پیش ہونے کے وقت بد خُلقی نہ دکھاؤ۔ اگر مقدمہ کا صحیح فیصلہ کرو گے، تو اللہ تعالیٰ اس کا بہت اجر دے گا۔ جس شخص کی نیت ٹھیک ہو گی اور خواہ اسے اپنے اور اپنے عزیز و اقارب

کے خلاف ہی فیصلہ کرنا پڑے، لیکن وہ حق وانصاف کے راستے پر گامزن رہے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کا ہر طرح کفیل ہوگا۔ لیکن جو شخص جادۂ عدل وانصاف سے بھٹک جائے گا اور ایسا فیصلہ کرے گا جس پر خود اس کا دل مطمئن ہونے کے لئے تیّار نہ ہوگا، تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو صرف اس صورت میں ثواب کا حقدار ٹھہرائے گا جب وہ اپنے اعمال خلوصِ نیّت کے ساتھ بجا لائیں گے۔ تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔" ۵

اگرچہ بہت سے آئمہ فقہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خط کو صحیح قرار دیا ہے۔ تاہم ظاہری مذہب کے ایک امام علاّمہ ابن حزم نے اس خط کی روایت کرنے والے ایک راوی پر اعتراض کیا ہے۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ ان کے اس اعتراض کی بڑی وجہ اس خط میں قیاس کو فوقیت دینے کی وجہ سے ہے۔ اس روایت کی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن یہ حقیقت ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دَور یا ان کے ایک صدی بعد تک یہ خط اسلامی ریاست کے عدالتی نظام کے بارے میں مسلمانوں کے طرزِ عمل کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اسی بنا پر امام ابن قیم نے یہ دعویٰ کیا ہے:۔

وَهٰذا كتابٌ جليلٌ - تلقاهُ العلماء بالقبول - وبنوا عليه اصول الحكم والشهادة

---

۵ اعلام الموقعین مطبوعہ مصر۔ جلد اوّل صفحہ ۸۵

والحاکم۔ والمفتی اَحْوَجُ شیئ الیہ والی تاملہٖ والتفقّہٖ فیہ [۶]

(ترجمہ) یہ وہ شاندار خط ہے کہ جسے امّتِ مسلمہ کے علماء میں قبولِ عام حاصل ہوا، اور انہوں نے اس پر قضاء اور گواہی کے احکامات مرتب کئے۔ حکمران اور مفتی اس خط پر غور و فکر کرنے کے زیادہ حاجتمند ہیں۔

حضرت علیؓ کا خط

اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک مکتوب بھی مشہور ہے، جس میں آپ نے والیٔ مصر کو وہاں قاضی مقرر کرنے کا اختیار دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ اسے کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے۔ ان کا یہ خط مشہور کتاب تاریخ بغداد سے پیش کیا جاتا ہے۔ حسب سابق اختصار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے صرف اس کے ترجمے کو نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

"لوگوں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے ایسے معزز شخص کو مقرر کرو، جو تمہارے نزدیک رعایا میں سب سے بہتر ہو، جس کی وجہ سے معاملات و مقدمات کے تصفیئے میں دقت بھی پیش نہ آئے، اور اہلِ معاملہ کو خوشامد کی ضرورت بھی پیش نہ آئے، جو غلطی پر اصرار نہ کرے، اور ہر حال میں حق و صداقت کی راہ پر گامزن رہے، جس کا نفس طمع کی طرف مائل نہ ہو، جو مقدمات کی سماعت سرسری طور پر نہ کرے بلکہ

---

۶ ایضاً صفحہ ۸۶

پوری توجہ سے فریقین کی باتیں سُنے ۔ ہر قِسم کے معاملات پر اس کی نظر گہری ہو ۔ شبہ کے موقعوں سے اچھی طرح واقف ہو ۔ مقدمات کی سماعت کے دوران میں جہاں کہیں شبہ کے مواقع آجائیں تو وہ ٹھہر کر خوب غور و فکر کرے اور دلائل اخذ کرکے ، معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے انتہائی غور و فکر اور صبر و استقلال سے کام لے اور جب کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اسے مضبوطی سے نافذ کرے ۔ اور اس کے نفاذ میں کسی قِسم کی دیر نہ کرے ۔ کسی قِسم کی سفارش اور حرص و طمع کو اپنے فیصلوں کی راہ میں حائل نہ ہونے دے ۔ اگرچہ ایسے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں ۔ لیکن قاضی کو بہرحال انہی صفات کا حامل ہونا چاہیئے ۔ جب تم کسی شخص کو قضاء کا عہدہ سونپو تو اس کی کافی تنخواہ مقرر کرو ۔ تاکہ اس کے اخراجاتِ زندگی اسے رشوت لینے پر مجبور نہ کردیں ۔ اس کی قدر و منزلت تمہارے دل اور تمہاری مجالس میں اتنی ہونی چاہیئے کہ کوئی شخص اس کے خلاف تمہارے کان بھرنے کی جرأت نہ کرسکے ۔" [ے]

اس کے علاوہ اسلام کے عدالتی نظام کے بارے میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بہت کچھ منقول ہے ، لیکن ان سب کا پیش کرنا باعثِ طوالت ہوگا ۔ اس لئے صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکتوبات پر اکتفا کیا گیا ہے کہ ان دونوں برگزیدہ ہستیوں کو

ے تاریخ بغداد از خطیب بغدادی ۔ مطبوعہ قاہرہ جلد ۱۴ صفحہ ۱۰۳

شعبہ قضاء کا عملی تجربہ تھا جس کی وجہ سے اس بارے میں ان کے افکار زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

قاضیوں کی تنخواہ

اسلام کے ابتدائی دور میں حکومت کا ڈھانچہ سادہ ہوتا تھا، اور بہت کم سرکاری اہل کار ہوتے تھے، جن میں قاضیوں کے عہدے سب سے زیادہ باوقار سمجھے جاتے تھے۔ لیکن انہیں تنخواہ زکوٰۃ کے فنڈ سے ادا کی جاتی تھی، جو ان کے تقویٰ کی صفت کو اور زیادہ اجاگر کر دیتی تھی، اور وہ معمولی معمولی ناجائز کاموں سے اپنا دامن بچاتے تھے۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے مصارف کی ایک شق عاملین بیان کی گئی ہے۔ اس سے عام طور پر صرف محکمۂ مال کے ملازم مراد لئے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے فقہائے کرام اس سے مراد عدلیہ سمیت تمام شعبوں کے سرکاری ملازم مراد لیتے ہیں۔ علّامہ ابن رشد ان فقہاء کا مسلک ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:۔

والذین اجازوھا للعامل وان کان غنیاً اجازوھا للقضاۃ ومن فی معناھم لمن لھم المنفعۃ عامۃ المسلمین۔ ؎۸

(ترجمہ) اور وہ فقہاء جنہوں نے محکمہ زکوٰۃ کے دولت مند ملازمین کے لئے زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ لینا جائز قرار دیا ہے۔ انہوں نے قاضیوں اور اس قسم کے دوسرے سرکاری ملازمین

؎۸ بدایۃ المجتہد۔ جلد اوّل صفحہ ۲۶۷ مطبوعہ قاہرہ۔

کو جن سے عامۃ المسلمین کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کا حقدار قرار دیا ہے۔

اور اس دور میں سرکاری اخراجات کی مشہور مدیں تین تھیں، دفاع، عدلیہ اور عاملین زکوٰۃ اور ان تینوں مدوں سے تعلق رکھنے والے تمام ملازمین کی تنخواہیں زکوٰۃ کی مد سے ادا کی جاتی تھیں۔

پانچواں باب

دورِ رسالتؐ کا عدالتی نظام

دورِ رسالت، اسلامی تاریخ کا سنہری دَور ہے، اور اس مبارک دَور کو بلاشبہ دوسرے تمام ادوار کے لیئے ایک اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ ہر دَور کے مسلمانوں نے حتی الوسع اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں تک پیغام حق پہنچانے کا فریضہ سونپا تھا، وہاں لوگوں کے درمیان تنازعات فیصلہ کرنے کی ذمّہ داری بھی آپؐ کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ آپؐ نے چالیس سال کی عمر میں مکّہ معظمہ میں اپنی نبوّت کا اعلان فرمایا تھا اور وہاں تیرہ سال تک دین اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ جب آپؐ کو ہجرت کا حکم دیا گیا تو آپؐ مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ وہاں اسلام کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اور مسلمانوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس لیۓ ان میں تنازعات کا واقع ہو جانا بھی ایک فطرتی امر تھا۔ تاہم اس مُبارک دَور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تقویٰ غالب تھا۔ اس لیئے ان کے درمیان اگر کوئی تنازعہ پیدا بھی ہوتا تو وہ فریقین کا ذکر کیئے بغیر، اس کے بارے میں شرعی حکم معلوم کر لیتے اور پھر اس پر بطیب خاطر عمل کر لیتے تھے۔ بہرحال یہ بھی امکان تھا کہ بعض تنازعات سنگین نوعیت اختیار کر لیں۔

اس لیۓ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا :-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ [1]

(ترجمہ) اے رسولؐ! لوگوں کے درمیان ان احکامات کے مطابق فیصلہ کرو کہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل کئے ہیں ۔

اور پھر ان تنازعات کے فریقین کے لئے ارشاد فرمایا :۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ [2]

(ترجمہ) اے رسولؐ! تیرے رب کی قسم، لوگ اس وقت تک مومن کہلانے کے مستحق نہ ہوں گے، جب تک وہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تجھے حکم یعنی فیصلے دینے والا نہ بنائیں گے اور پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی بوجھ محسوس نہ کریں، اور تیرے ہر حکم اور فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں گے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک ہی وقت میں مختلف حیثیتیں جمع تھیں ۔ آپؐ صدرِ ریاست بھی تھے، سپہ سالار بھی تھے، مفتی بھی تھے اور قاضی کے فرائض بھی آپؐ ہی کو سرانجام دینے ہوتے تھے، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے ۔ تقویٰ کے غلبہ کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تنازعات کا وجود قریباً قریباً مفقود تھا ۔ تاہم جو دیہاتی عرب نئے نئے

---

[1] سورۃ المائدہ : ۴۸

[2] سورۃ النساء : ۶۵

مسلمان ہوتے تھے۔ ان میں تنازعات کی شرح نسبتاً زیادہ تھی۔ چونکہ آپؐ کے عمل نے امتِ مسلمہ کے لئے ہر دور میں نمونہ بننا تھا اس لئے آپؐ نے ان تنازعات کے فیصلے کے لئے ایسے اصول مقرر کر دیئے تھے کہ وہ قیامت تک کیلئے مسلمان قاضیوں کے لئے راہنمائی کا کام دیتے رہیں گے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت منقول ہے جس میں آپؐ ارشاد فرماتی ہیں :-

"دو آدمی اپنے کسی جھگڑے کا فیصلہ کرانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دونوں کے درمیان وراثت کا کوئی جھگڑا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی باتیں سننے سے قبل ہی ارشاد فرمایا کہ تم دونوں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اپنے جھگڑے کے تصفیے کے لئے آئے ہو۔ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنی چرب زبانی کے بل پر اپنے حق میں ایسی دلیلیں پیش کرے جو دوسرا پیش نہ کر سکے۔ میں تو انہی دلیلوں کے مطابق ہی فیصلہ کروں گا، جو میرے سامنے پیش کی جائیں گی۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر کوئی شخص میرے فیصلے کے باوجود اپنے بھائی کی جائیداد کا کچھ حصہ ناجائز طور پر حاصل کر لیتا ہے تو دراصل وہ اپنے لئے آگ کا ٹکڑا حاصل کرتا ہے، قیامت کے دن آگ کا وہ ٹکڑا اس کے گلے میں پڑا ہوگا، اور وہ پھکنی سے اسے اور زیادہ بھڑکا رہا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر وہ دونوں شخص رو پڑے۔ اور ہر ایک نے کہا "یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اپنا حق بخوشی اپنے بھائی کو دیتا ہوں" حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "جاؤ اور جائیداد کو

حق و انصاف اور شریعت کے احکامات کے مطابق آپس میں تقسیم کر لو۔ تم میں سے ہر ایک کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ دوسرے کے ساتھ ٹھیک اور درست معاملہ کرے "۔ ۳ھ

علیحدہ قاضیوں کا تقرر

ارشادِ الٰہی کے مطابق مدینہ منورہ میں تو قاضی کے فرائض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرانجام دینے لگے۔ تاہم فتوحات کے بعد جب مزید علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آنے شروع ہوئے، تو آپؐ نے ان علاقوں کے نظم ونسق کے لئے والی مقرر فرمائے۔ ہر علاقے کا والی نہ صرف یہ کہ وہاں کا نظم ونسق چلاتا تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اس علاقے کے لئے قاضی کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔ اس لئے والی منتخب کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ اسے قرآن وسنت پر کافی عبور ہو چنانچہ آپؐ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا، اور حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ کا والی اور قاضی بنایا۔ حضرت معاذؓ کو قاضی بناتے وقت قضاء کے بارے میں آپؐ نے انہیں جو ہدایات دیں اسلام کے عدالتی نظام میں انہیں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہدایات کو درج ذیل الفاظ کی صورت میں نقل کیا ہے:۔

عن معاذٍ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لمّا بعثہٗ الی الیمن۔ قال کیف تصنع ان عرض لک قضاءٌ؟ قال اقضی بما فی کتاب اللہ

۳ھ مسند احمد بن حنبل۔ کتاب القضاء ۔ (اس کتاب کے متعدد ایڈیشن ہیں۔ اس لئے صفحہ کا حوالہ بیکار ہے)

قال فان لم یکن فی کتاب اللہ ؟ قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ قال فان لم یکن فی سنّۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ قال اجتہد برائی لا آلو۔ قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم صدری ثمّ قال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ [۴]

(ترجمہ) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا والی مقرر فرمایا تو پوچھا کہ "اگر تجھے فیصلہ کرنا پڑ گیا تو کیا کروگے"؟ کہا کہ "میں قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کروں گا" فرمایا کہ "اگر وہ فیصلہ قرآن مجید میں نہ ہوا تو"؟ آپ نے کہا کہ "سُنّتِ رسول ؐ کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا"۔ آپ نے پھر پوچھا کہ "اگر سُنّتِ رسول ؐ میں بھی وہ فیصلہ نہ ہوا تو پھر کیا کروگے"؟ اس پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کروں گا۔ نہ اس سے کم کروں گا، اور نہ ہی اس سے زیادہ کروں گا"۔

دورِ نبوی ؐ میں عدالتی فیصلوں کا مدار

اس گفتگو سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس دور

---

[۴] اعلام الموقعین جلد اوّل صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ مصر۔

میں عدالتی نظام کی اوّلین بنیاد کتاب اللہ تھی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت سب سے پہلے کتاب اللہ اور وحیٔ الٰہی کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ لیکن جن معاملات کے بارے میں وحیٔ الٰہی میں کوئی حکم نہ ہوتا تھا، ان کے متعلق آپ خود اجتہاد کرتے تھے۔ اور بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی مشورہ لے لیتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے افعال واقوال عدالتی نظام کی دوسری بنیاد بن گئے۔ مختصر یہ کہ اس دَور میں اسلامی ریاست کے عدالتی فیصلے قرآن مجید، سُنتِ رسولؐ اور اجتہاد کے ذریعے طے پاتے تھے۔

دَورِ نبویؐ میں صحابہ کرامؓ کا اجتہاد

شاید اس امر پر حیرت کا اظہار کیا جائے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس دَور میں صرف معدودے چند صحابہ نے قاضی کے فرائض سرانجام دیئے، لیکن جہاں تک شرعی آراء کا تعلق ہے، وہ تو اکثر صحابہ کرامؓ سے دریافت کی جاتی تھیں، تو کیا وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اجتہاد سے کام لیتے تھے، اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں بہت سے واقعات نقل کئے ہیں کہ جن کے مطابق صحابہ کرامؓ نے آپؐ کی موجودگی میں شرعی مسائل میں اجتہاد سے کام لیا۔ لیکن آپؐ نے انہیں کوئی ملامت نہ فرمائی۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو:-

وَقد اجتهد الصّحابة فی زمن النبیّ صلّی اللہ علیه وسلّم فی کثیر من الاحکام ولم یعنفهم۔

(ترجمہ) صحابہ کرام رضؓ نے بہت سے شرعی احکامات میں اجتہاد سے کام لیا۔ لیکن آپؐ نے انہیں ملامت نہ فرمائی۔ ؎۵

آپؐ کے دَور کے تیسرے قاضی حضرت علی رضؓ تھے، جنہیں آپ نے یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ آپ کے اجتہاد کرنے کے واقعات کافی مشہور ہیں، اور بعض کے متعلق تو مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سُن کر محظوظ ہوتے تھے۔ امام ابن قیمؒ نے ایک ایسے ہی مقدمے کی روداد نقل کی ہے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا۔

"تین شخص ایک بچے کے بارے میں دعویٰ لے کر آئے، اور ان میں سے ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ یہ اس کا بچہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کی اور جس شخص نے قرعہ اندازی جیت لی بچّہ اس کے حوالے کر دیا اور دوسرے دونوں کو اس سے دو تہائی دیت دلوادی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ فیصلہ پہنچا تو آپؐ حضرت علی رضؓ کے اس عدالتی فیصلے سے خوب محظوظ ہوئے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھیں ظاہر ہو گئیں۔" ؎۶

دَورِ نبویؐ میں عدالتی سزا

دَورِ نبویؐ میں نہ کوئی جیل خانے تھے اور نہ ہی کوڑے مارنے کے لئے جلّاد مقرّر تھے۔ عدالت شاذ و نادر ہی کوئی سزا دیتی تھی۔ اس لئے اس بارے میں بہت

؎۵ اعلام الموقعین جلد اوّل صفحہ ۲۰۳

؎۶ " " " "

کم واقعات ملتے ہیں۔ اس دور کی سب سے سخت اور مؤثر سزا قصور وار یا مجرم کا سوشل بائیکاٹ تھا۔ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس قسم کا مقاطعہ بڑی سخت اور مؤثر سزا تھی کہ جس کے خدشے سے جرائم کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال کافی ہو گی جو حدیث کی مشہور کتاب سنن ابوداؤد میں بڑی تفصیل سے درج ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ کسی صحابی نے اپنے مکان میں کوئی اونچی سی تعمیر کرائی (یعنی چوبارہ یا بالاخانہ بنوایا)۔ اتفاق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا، تو آپؐ نے مالک مکان کا نام دریافت فرمایا۔ اس کے بعد جب وہ صحابی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا، تو آپؐ نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا۔ بلکہ اس کی جانب سے منہ پھیر لیا، جو آپؐ کی جانب سے سماجی مقاطعہ کا اظہار تھا۔ جب صحابیؓ مذکور کو اس ناراضگی کی وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے فوراً جا کر اپنی اس زائد تعمیر کو منہدم کر دیا اور معافی کا طلب گار ہوا۔ آپؐ نے اسے معاف کرتے ہوئے، تمام مسلمانوں کو خبردار کیا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں پر امتیاز حاصل کرنے کے لئے کوئی معمولی سی اضافی تعمیر کرے گا تو قیامت کے دن وہی اضافی تعمیر اس پر لاد دی جائے گی۔ یعنی اسے سخت عذاب ہو گا۔ ؎[5]

سوشل بائیکاٹ یا سماجی مقاطعے کی یہ سزا اتنی کارگر تھی کہ اس نے بہت سے جرائم کا قلع قمع کر دیا۔ آج بھی اس سزا کو مؤثر طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دورِ نبویؐ میں حدود کے نفاذ کے متعلق کوئی مستند واقعات نہیں ملتے

؎ سنن ابوداؤد جلد چہارم مطبوعہ مصر صفحہ ۴۸۷

بلکہ اس سلسلے میں جو مقدمات بھی آپ کی خدمت میں پیش ہوئے ۔ آپ نے شک کا فائدہ دیتے ہوئے ان پر شاذ و نادر ہی حدود کا نفاذ فرمایا ۔ رجم کے بارے میں جو روایت ملتی ہے ، علماء نے اس کے بارے میں یہ تصریح کی ہے کہ یہ واقعہ زناکاری کے شرعی احکامات نازل ہونے سے پہلے کے عرصے سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس لئے اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ۔

چھٹا باب

خلافتِ راشدہ کا عدالتی نظام

اس دَور کی مختصر سیاسی حالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصالِ مبارک ہوا، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپؐ کا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ آپؓ کے دَور میں بہت سے عربی قبائل نے بغاوت کر دی۔ تاہم حضرت ابوبکرؓ کے عزمِ صادق اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قوتِ ایمانیہ نے اس پریشان کن صورتِ حالات میں نہایت کامیاب طریقے سے اسلام کی خدمت کی۔ آپ نے فوراً ہی باغی قبائل کی طرف اسلامی افواج کو روانہ کیا، جنہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں ان قبائل کے شرپسندوں کو سیدھے راستے پر لگا دیا اور جلد ہی دوبارہ عربی اتحاد قائم ہو گیا۔

اس مہم کے خاتمے پر آپ نے ایرانی اور رومی سلطنتوں کی جانب سے خطرے کا سدِّ باب کیا۔ اسلام کی روز افزوں ترقی کو ان سلطنتوں نے اپنے لئے ایک خطرہ سمجھا تھا، وہ اسے ختم کرنے کے منصوبے ہی بنا رہے تھے کہ اسلامی افواج نے انہیں جا لیا۔ ابھی ان لڑائیوں کا فیصلہ ہی نہیں ہوا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور آپؓ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عنانِ خلافت سنبھالی۔ جنہوں نے ان سلطنتوں کے بیشتر علاقوں کو فتح کر لیا۔ مشرقی جانب سے مسلمان اکثر ایرانی شہروں پر غلبہ حاصل کرتے ہوئے دُور تک پہنچ گئے۔ شمالی جانب سے انہوں نے شام اور بلادِ ارمینیا پر قبضہ

کر لیا۔ مغربی جانب سے مصران کے زیرِ نگین ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دنیائے اسلام کے بڑے بڑے شہر مثلاً فسطاط، کوفہ اور بصرہ آباد ہوئے اور وہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جن میں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے آباد ہو گئی۔ عربوں کے علاوہ بہت سی دوسری اقوام حلقہ بگوش اسلام ہو گئیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اسلامی فتوحات نے مشرق و مغرب میں نہایت وسعت حاصل کی، لیکن ابھی تک یہ عمارت مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ انہیں ایک سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی آپ کے مخالفوں نے آپ کے خلاف ایک سخت شورش برپا کر دی۔ مصر، شام اور عراق سے ان مخالفین کی کئی جماعتیں مدینہ منورہ پہنچ گئیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ جس سے مسلمانوں میں اختلاف کی بنیاد پڑ گئی اور ان کے دو فرقے ہو گئے۔ ایک فرقہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا اور اس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ دوسرا گروہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو گرفتار کر کے انہیں سخت سزا دینا چاہتا تھا۔ اس گروہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت کر لی تھی۔ پہلا گروہ عراق کے دار السلطنت کوفہ میں اور دوسرا گروہ شام کے پایۂ تخت دمشق میں رہتا تھا۔ ان دونوں گروہوں کے بغض و عداوت اور لعن طعن کا یہ نتیجہ ہوا کہ صفین کے ریگستان میں دونوں کے درمیان سخت معرکہ ہوا۔ تاہم کسی فریق کے لئے اس لڑائی کا کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہ نکلا۔ کیونکہ اہلِ شام نے کتاب اللہ کو حکم بنایا اور اکثر اہلِ عراق نے بھی اسے قبول کر لیا تھا، لیکن یہ ثالثی حضرت امیر معاویہؓ کے حامیان کی طاقت اور حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی کمزوری کا سبب بن گئی۔ کیونکہ ان کی فوج میں ایسے اشخاص پیدا

ہوگئے تھے جنھوں نے ثالثی قبول کرنے کے معاملے پر اعتراض کیا اور جن لوگوں نے اسے قبول کیا، ان پر لعن طعن کرنے لگے۔ یہی لوگ بعد میں خوارج کہلائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے مخالف فریق کو چھوڑ کر خود اپنی فوج کے اس طبقے یعنی خوارج کی بیخ کنی میں مصروف ہوگئے اور آخر انہی خوارج میں سے ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپ کو اچانک شہید کر دیا تھا۔

عدلیہ دورِ صدیقی میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انصار اور مہاجرین نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ یعنی جانشین منتخب کیا۔ ابتدائی اختلاف کے بعد جب انتخاب مکمل ہو گیا تو اتفاق رائے سے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی جو بیعتِ خاصہ کہلاتی ہے۔ اس سے دوسرے روز مسجدِ نبوی[۴] میں عام بیعت ہوئی۔ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطاب فرمایا۔ اس کے بعد وہاں موجود تمام مسلمانوں نے بیعت کی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ آپ کی یہ تقریر فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک یادگار چیز ہے۔ اس کے بعض اجزاء خلیفہ اوّل کے احساسِ ذمّہ داری اور تصوّرِ عدل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:—

> "حکومت میرے لئے باعثِ راحت نہیں ہے بلکہ اس سے مجھے ایک ایسے عظیم معاملے کی تکلیف دی گئی ہے جو میری برداشت سے زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ عزوجل کی مدد و نصرت کے بغیر اس ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔۔۔۔۔ میں تمہارا امیر بنایا گیا ہوں، اور میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں راہِ راست پہ

چلوں تو میری مدد کرو۔ اگر بے راہ چلوں، تو سیدھا کر دو۔ تم میں جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے، انشاء اللہ اس کا حق دلاؤں گا۔ اور تم میں سے جو قوی ہے وہ میری نظر میں کمزور ہے، اس سے انشاء اللہ حق لے کر چھوڑوں گا۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں، تم میری اطاعت کرو، اور جب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں، تو تمہیں میری اطاعت نہیں کرنی چاہیئے"۔

آپ نے عدلیہ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا۔ اس کے بارے میں قاضی ابن عرنوس لکھتے ہیں کہ علامہ بغوی نے میمون بن مہران سے روایت کی ہے کہ :۔

"آپ کے سامنے جب کوئی تنازعہ پیش ہوتا تھا تو سب سے پہلے آپ قرآن مجید ہی کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے مدد لیتے۔ اگر آپ کو ایسا کوئی قول نہ ملتا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں آکر دریافت کرتے کہ فلاں معاملے میں کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل معلوم ہو تو اطلاع دے۔ جب ایسا کوئی عمل نہ ملتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جو اہل الرائے اور بزرگ تھے۔ انہیں جمع کر کے مشورہ کرتے جس رائے پہ اکثریت متفق ہو جاتی اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے"۔

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے دورانِ خلافت، اسی طریقے پر عمل کرتے تھے۔ اگر انہیں کتاب وسنت کے کسی فیصلے کا علم نہ

ہو سکتا تھا تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ بناتے لیکن اگر اس بارے میں حضرت ابوبکرؓ کا بھی کوئی فیصلہ نہ ملتا تو سرکردہ صحابہؓ کو جمع کرکے وہ معاملہ ان کے سامنے رکھتے تھے اور ان کی رائے پر عمل کرتے۔" [1]

اپنے دورِ خلافت میں زیادہ تر مقدمات کے فیصلے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود کرتے تھے۔ لیکن بعض روایات میں منقول ہے کہ جب آپ کی خلافت کی ذمّہ داریاں بڑھ گئیں تو آپ نے یہ خدمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد کردی۔ لیکن آپ کی زندگی میں ان کے پاس سرے سے کوئی قابلِ ذکر مقدمہ ہی درج نہ ہوا کہ وہ اس کا فیصلہ کرتے۔

عدلیہ عہدِ فاروقی میں [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل آج تک ضرب المثل بنا ہوا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حساب سے ڈرنے والے تھے۔ اور لوگوں پر حکومت کرنے میں جس بے لاگ سوجھ بوجھ، باریک بینی اور محاسبۂ نفس کی ضرورت ہوتی ہے، اسے خوب جانتے تھے۔ ایک دفعہ دو جھگڑنے والے آپ کے پاس آئے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ اے باری تعالیٰ مجھے ان کے بارے میں روشنی عطا فرما۔ ان میں سے ہر ایک میرا دین چاہتا ہے۔

---

[1] تاریخ القضاء فی الاسلام از ابن عرنوس۔ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۹

[2] یہ ساری تفصیلات محمد حسین ہیکل کی مشہور کتاب "عمر فاروق اعظم" سے لی گئی ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ صفحات کا حوالہ آگے دیا جائے گا۔

عدل قائم کرنے میں وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتتے تھے۔ بلکہ ایک بار جب انہوں نے لوگوں کو کسی بات سے روکنا چاہا تو اپنے اہل وعیال کے پاس گئے۔ اور فرمایا میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جسے میں نے کسی کام سے روکا ہو اور پھر اس نے وہی کام کیا ہو۔ سوائے اس شخص کے جسے سزا دینے میں مجھ سے کمزوری ظاہر ہوئی ہو۔ آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن مصر میں تھے۔ ایک دن انہوں نے ابوسروعہ کے ساتھ مل کر نبیذ پی لی، جس سے ان پر نشہ طاری ہو گیا۔ وہ دونوں حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس پہنچے کر وہ ان پر حد جاری کر دیں۔ ابن عاص کہتے ہیں کہ میں نے انہیں جھڑک کر نکال دیا۔ اس پر عبدالرحمٰن بولے۔ "اگر آپ نے حد جاری نہ کی تو جب میں اپنے والد یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤں گا، تو اس کا ذکر کروں گا۔" میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ان دونوں پر حد نہ لگائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناراض ہوں گے، اور مجھے معزول کر دیں گے۔ اس لئے میں انہیں گھر کے صحن میں لایا اور ان پر حد لگائی۔ عبدالرحمٰن بن عمر (رضی اللہ عنہ) گھر کی کوٹھڑی میں گھس گئے اور اپنا سر مونڈا۔ خدا کی قسم اس واقعہ کے متعلق میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک حرف تک نہ لکھا۔ یہاں تک کہ ان کا یہ خط مجھے ملا۔ اللہ کے بندے امیر المومنین عمرؓ کی طرف سے عاصی بن عاصی[۳] کے نام :-

"اے ابن عاص تمہاری جرأت اور بدعہدی پر مجھے حیرت ہے، اور میں تمہیں معزول کر کے چھوڑوں گا۔ تم نے عبداللہ حمٰن کو اپنے گھر میں کوڑے لگائے اور وہیں اس کا سر مونڈا۔ حالانکہ تم

---

[۳] عربی زبان میں عاصی کے معنی گناہگار کے بھی ہیں۔

جانتے تھے کہ یہ کام میری مرضی کے خلاف کر رہے ہو۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہیئے تھا، جو تم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہو۔ لیکن تم نے سمجھا کہ وہ امیرالمؤمنین کا بیٹا ہے۔ حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق وصول کرنے میں رعایت و نرمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے، اسی وقت اسے ایک اونی قبا پہناؤ اور کاٹھی پر بٹھا کر فوراً میرے پاس بھیج دو۔ تاکہ وہ اپنی بدکرداری کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔"

جیسا کہ ان کے والد نے فرمایا تھا، میں نے اسی طرح انہیں بھیج دیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معذرت نامہ لکھا کہ میں نے انہیں اپنے گھر کے صحن میں حد لگائی۔ اور خدا کی قسم جس سے بڑی کوئی قسم نہیں، میں ہر ذمی اور ہر مسلمان کو اپنے گھر ہی میں حد لگاتا ہوں، اور یہ خط عبدالرحمٰن بن عمرؓ کے ہاتھ روانہ کر دیا۔ عبدالرحمٰن اپنے والد کے پاس لے گئے۔ جب وہ ان کے سامنے پہنچے تو اونی قبا ان کے جسم پر تھی اور سواری کی تکلیف سے وہ چل نہیں سکتے تھے۔ ان کے والد نے پوچھا "عبدالرحمٰن! تم نے یہ حرکت کی ہے"؟ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کی سفارش کی اور کہا "امیرالمؤمنین! ان پر حد لگائی جا چکی ہے" لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی بات پر دھیان نہ دیا اور عبدالرحمٰن بن عمرؓ چلانے لگے "میں بیمار ہوں آپ مجھے قتل کر رہے ہیں"۔ روایت میں ہے کہ اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے ان پر حد دوبارہ لگوائی اور بعد میں انہیں قید میں ڈال دیا گیا۔ [۲]

---

[۲] بعض روایات کے حوالے سے جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ (باقی صفحہ آئندہ)

(اسلام کے اصول مساوات کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انصاف امیر و حقیر، اور والی و رعیت میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتا تھا۔ قبیلہ غسان کے امیر جبلہ بن ایہم نے جب ایک بدوی کو تھپڑ مارا تو آپ نے اس مغرور امیر سے بدلہ دلوانے کا حکم دیا۔ محمد بن عمروؓ بن عاص نے ایک مصری کو تازیانے مارے اور ساتھ ہی کہتے جاتے تھے کہ لے میں بڑوں کی اولاد ہوں۔ حضرت عمروؓ بن عاص نے اس مصری کو قید کر دیا کہ مبادا وہ امیرالمؤمنین سے ان کے بیٹے کی شکایت نہ کر دے۔ جب وہ قید سے چھوٹا تو سیدھا مدینہ منورہ پہنچا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے اسے تو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اور ابن عاص اور ان کے بیٹے کو مصر سے بلا کر مجلسِ قصاص میں طلب کیا (خیال رہے کہ مجلسِ قصاص کوئی علیحدہ عمارت نہ تھی بلکہ اس دور میں دوسرے تمام امور کی طرح اس کے اجلاس بھی مسجدِ نبوی میں ہوتے تھے۔)

جب دونوں باپ بیٹے مجلسِ قصاص میں پیش ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلند آواز میں فرمایا "مصری کہاں ہے؟ لے یہ کوڑا اور بڑوں کی اولاد کو مار۔" مصری نے محمد کو کوڑے مارنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ وہ بے دم ہو گیا۔ مصری انہیں مارتا جاتا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے جاتے تھے "بڑوں کی اولاد کو مار۔" جب وہ جی بھر کر مار چکا اور کوڑا امیرالمؤمنین کو واپس کرنے لگا، تو حضرت عمرؓ نے اسے فرمایا: "عمرو بن العاصؓ کی چندیا پہ مار، خدا کی قسم بیٹا تجھے ہرگز نہ مارتا، اگر اسے باپ کے اقتدار کا گھمنڈ نہ ہوتا۔" ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: "امیرالمؤمنین!

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کچھ کوڑوں کے بعد عبدالرحمٰن کی موت واقع ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے بقیہ کوڑے ان کی قبر پہ مارے، تو اس کی کوئی سند نہیں۔ ۱۲

آپ بھرپور سزا دے چکے ہیں" اور" مصری نے کہا " امیرالمؤمنین! جس نے مجھے مارا تھا، مَیں نے اس سے بدلہ لے لیا" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا"قسم ہے خدا کی اگر تو ابن عاص رضؓ کو مارتا، تو ہم اس وقت تک بیچ میں نہ آتے، جب تک تو خود ہی اپنا ہاتھ نہ روک لیتا۔ اور عمروؓ بن عاص کی طرف مخاطب ہو کر غضبناک لہجے میں فرمایا:" عمروؓ! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا ہے۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔ ؎۵

عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دَورِ حکومت میں عدالتی کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد تھا۔ خلیفہ بننے کے بعد کچھ عرصہ تک آپ یہ ذمہ داری نبھاتے رہے۔ لیکن فتوحات کی کثرت کی وجہ سے انتظامی معاملات زیادہ ہو گئے، تو آپ نے عدالتی کام کے لئے علیحدہ قاضی مقرر کر دیے۔ پہلے مدینہ منوّرہ کے لئے عدالتی فرائض خود سرانجام دیتے تھے۔ اب آپ نے یہ خدمت ایک صحابی حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دی، اور انہیں قاضی کے نام سے موسوم کیا۔ اس طرح قاضی کے عہدے کی سرکاری طور پر ابتداء حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی۔ لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے تنازعات ب قاضی ابو الدرداءؓ (رضی اللہ عنہ) کے پاس لے جائیں۔ پھر جب کوفہ اور بصرہ کے شہر آباد ہو گئے۔ بہت سے عربوں نے بھی ان نئے شہروں کو اپنا مسکن بنایا۔ حضرت شریحؒ کو اس اہم شہر کا قاضی بنایا گیا۔ آپ نے اس عہدے پر پورے ساٹھ سال خدمات انجام دیں۔ اسلامی تاریخ میں آپ سب سے لمبی خدمات انجام دینے والے قاضی ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کا قاضی مقرر

؎۵ عمر فاروقِ اعظم از ہیکل اردو ترجمہ مطبوعہ لاہور۔ صفحات ۵۹۴، ۵۹۵

کیا گیا۔ اس کے بعد جب مصر اسلامی علمداری میں شامل ہو گیا تو قیس بن ابی العاص سہمی کو وہاں کے مسلمانوں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے قاضی بنا دیا گیا۔ ان تمام قاضیوں کے فرائض صرف عدالتی امور تک محدود تھے اور وہ کتاب و سنت کی تعلیمات کی حدود میں رہتے ہوئے آزادانہ فیصلے کرتے تھے۔ ان کا تقرر، عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی اور اختیارات کی تقسیم و تنظیم کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہ قدم مملکت اسلامیہ کے بدلتے ہوئے حالات سے مجبور ہو کر ضرورت کے تحت اٹھایا گیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قضاۃ کے انتخاب میں دوسری سرکاری اہلکاروں کے انتخاب کی طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ اپنی وہبی صلاحیتوں کا استعمال فرمایا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شریعت و فقہ کے عالم تھے اور اس باب میں ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ کوئی دوسرا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور عرب کے تمام قبائل کا علم دوسرے پلڑے میں، تو بھی حضرت عمر رضؓ کے علم کا پلڑا بھاری رہے گا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے قریش کے عہدۂ سفارت پر مامور تھے۔ اسلام لانے کے بعد ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل ہوتی، اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سیکھتے، اور آپؐ کی سنت و قضاۃ سے واقفیت بہم پہنچاتے۔ اس کے علاوہ ان میں لوگوں کے جوہر پہچاننے اور ان کے بعض کاموں سے ان کی خصوصیات معلوم کرنے کا ملکہ تھا۔ قاضی شریحؒ کو کوفہ کا قاضی بنائے جانے کا فیصلہ اس کا بہترین ثبوت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پہ سوار ہو گئے گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے واپس کرنا چاہا۔

مالک نے انکار کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کسی کو ثالث بنالو" گھوڑے کے مالک نے کہا کہ شریحؒ عراقی اسے بطورِ ثالث قبول ہے۔ چنانچہ دونوں شریحؒ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے فریقین کے دلائل سُن کر فیصلہ دیا کہ "امیرالمؤمنین! یا گھوڑا خرید لیجیے یا جیسا تھا ویسا واپس کیجیے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "فیصلہ یہی ہے" اور شریحؒ کو کوفے کا قاضی مقرر کر دیا، جہاں وہ اس منصب پر ساٹھ سال تک فائز رہے۔ [۶]

قاضیوں کے اختیارات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دَور میں جو علیحدہ قاضی مقرر کئے تھے۔ بعض اہلِ علم اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے انتظامیہ اور عدلیہ کو کلی طور پر علیحدہ کر دیا تھا۔ لیکن اس دَور کے مقدمات کی تفصیلات کو سامنے رکھا جائے تو ان سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے عدالتی نظام کو ایک علیحدہ محکمہ کی شکل دی۔ لیکن اس محکمے کے قاضیوں کے اختیارات زیادہ تر شہری تنازعات فیصلہ کرنے تک محدود تھے۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں ایسے مقدمات کو دیوانی کہا جاتا ہے۔

پروفیسر محمد بک خضری قاضی کے اختیارات پر بحث کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:۔

> "تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں قاضیوں کا دائرۂ عمل صرف شہری تنازعات کے تصفیوں تک محدود تھا۔ قصاص اور حدود کے اجراء کا کام خلفاء اور علاقائی حکام خود سرانجام دیتے تھے، اور وہی ان کا نفاذ کرتے تھے۔ ہمیں تاریخ سے ایسے اَن گنت واقعات کا علم تو ہوتا ہے کہ قتل کرنے،

---

[۶] ایضاً صفحات ۶۰۳، ۶۰۴

شراب نوشی اور اس قسم کے دوسرے جرائم میں خلیفہ یا اس کے عمال نے مجرموں کو قتل اور کوڑوں کی سزا کا حکم سنایا۔ لیکن کسی قاضی کے متعلق ہمیں یہ علم نہیں کہ اس نے اس قسم کے مقدمات جنہیں موجودہ زمانے کی اصطلاح میں فوجداری کہا جاتا ہے کی سماعت کی ہو۔ قید اور جرمانہ جیسی تادیبی سزائیں بھی خلیفہ یا اس کا مقرر کردہ عامل ہی دیتا تھا۔ اس طرح اس دور میں قضاء کا دائرہ بڑی حد تک دیوانی مقدمات تک محدود تھا۔" ؎

قاضی یا تو براہِ راست خلیفہ یا صوبے کے حکمران کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ اور عام طور پر اس کا انتخاب خلیفہ خود فرماتے تھے اور اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو احتیاط فرماتے تھے، اس کی جھلک پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ بعض دفعہ مختلف صوبوں کے گورنروں کو بھی قاضی مقرر کرنے کے اختیارات سونپ دیئے جاتے تھے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو صفحات سابقہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عدالتی امور کے بارے میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رض کو جو مکتوب ارسال کیا تھا وہ بھی صفحاتِ سابقہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ اس میں آپ نے وہ تمام ہدایات درج کر دی تھیں، جو اسلامی ریاست کے عدالتی نظام کو چلانے کے لئے ضروری ہیں۔ اسی طرح آپ نے کوفہ کے قاضی شریح رح کو بھی تقرر کے وقت ایک ہدایت نامہ دیا تھا جس میں انہی امور کی تاکید کی گئی تھی کہ اگر قرآن و سنت میں کسی معاملے کے بارے میں رہنمائی نہ ملے تو پھر اجتہاد سے

؎ تاریخ القضاء فی الاسلام از ابن عرنوس مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵

کام لو۔

عہدِ نبوی ؐ اور عہدِ صدیقی رضؓ کی طرح حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں بھی عدلیہ کی شان وشوکت وعظمت برابر قائم رہی اور اسلام کے بنیادی قانونِ مساوات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے امیر، غریب اور چھوٹے بڑے سب لوگوں کو قانون کی نظر میں برابر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ خود خلیفہ بھی، عدالت میں ایک معمولی فردِ مملکت کی طرح حاضر ہوتے تھے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضؓ نے ایک گھوڑا خریدا اور پرکھنے کے دوران گھوڑے کو کچھ نقصان پہنچ گیا، تو مالک نے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ جب معاملہ قاضی شریح رحؒ کے سامنے پیش ہوا، تو انھوں نے حضرت عمر رضؓ کے خلاف فیصلہ دیا۔ حضرت عمر رضؓ اور حضرت ابی رضؓ بن کعب کے درمیان کسی معاملہ میں اختلاف ہو گیا، تو وہ معاملہ حضرت زید بن ثابت رضؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدعا علیہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے آپ کی تعظیم کی، تو آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس بھی کوئی ثبوت نہ تھا۔ اور حضرت عمر رضؓ نے دعویٰ سے انکار کر دیا۔ حضرت ابی رضؓ نے شرعی قاعدے کے مطابق حضرت عمر رضؓ کو حلف دینا چاہا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کا خیال کر کے حضرت ابی رضؓ سے درخواست کی کہ امیر المؤمنین کو قسم سے باز رکھو۔ حضرت عمر رضؓ اس طرفداری سے رنجیدہ ہو گئے اور فرمایا "جب تک تمہارے نزدیک ایک فردِ مملکت اور عمر رضؓ برابر نہ ہوں گے تم منصبِ قضاء کے قابل نہیں بن سکتے۔" ؎۸

؎۸ "الفاروق" از علامہ شبلی مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۶۰ء۔ صفحہ ۳۰۴

عدلیہ عثمانی دورِ میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ بڑے ہی نرم دل حکمران تھے۔ شورش پسند لوگوں نے آپ کی اس طبعی نرم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا، اور جیسا کہ اس دور کی سیاسی حالت کے ضمن میں بتایا جاچکا ہے، آخر انہی شورش پسند لوگوں نے آپ کو شہید کر ڈالا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو عدالتی نظام قائم کر دیا تھا، بدستور اسی پر عمل ہوتا رہا۔ تاہم انہوں نے اس سلسلے میں ایک تبدیلی کی۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے عدالتوں کی کارروائی مساجد میں ہوتی تھی۔ اب انہوں نے اس مقصد کے لیے ایک علیحدہ عمارت بنوادی۔ جو دار القضاء کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپ نے اگرچہ کچھ صوبوں کے گورنروں کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے والی مقرر کئے تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقرر کئے ہوئے کسی قاضی کو نہیں بدلا تھا۔

حضرت علیؓ کا عدالتی نظام

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح خود اعلیٰ پایہ کے قاضی تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے دور میں قاضی مقرر کیا تھا۔ وہ آپ کے عدالتی نظام کی سوجھ بوجھ سے کافی متاثر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہم سب میں سے علم قضاء کے بہت بڑے عالم ہیں۔ اس لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انہیں یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا [۹]

آپ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جب کبھی کوئی

---

[۹] تاریخ الخلفاء از علامہ سیوطی اردو ترجمہ مطبوعہ لاہور۔ صفحہ ۹۲

قابلِ اعتماد شخص مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ سناتا ہے تو میں اس فیصلے سے اختلاف نہیں کرتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ تم سات چیزوں میں دوسرے لوگوں سے افضل ہوگے۔ ان سات چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم امورِ الٰہی میں بہتر قائم ہو اور دوسرے یہ کہ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے بہت بڑے قاضی ہو۔ سنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہت سے عدالتی فیصلے مشہور ہیں، لیکن ان کے علمِ قضاء کی جھلک دکھانے کے لئے اختصار کو مدِنظر رکھتے ہوئے صرف چند فیصلے نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ آپ کے سامنے قتل کا ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک شخص کسی گلی میں خون آلود چھری کے ساتھ پایا گیا۔ اور اس کے سامنے ایک مقتول خون میں لوٹ رہا تھا۔ چند آدمی جو ادھر سے گزر رہے تھے۔ اس شخص کو اسی حالت میں گرفتار کر لائے۔ اس شخص نے اقبالِ جرم کر لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دے دیا کہ اس کے بدلے میں اسے بھی قتل کر دیا جائے۔ جب اسے جلاد کے پاس روانہ کیا گیا، تو ایک دوسرا شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا: "اسے قتل کرنے میں جلدی نہ کرو۔ امیر المؤمنین کے پاس چلو" کیونکہ اصلی قاتل میں ہوں" یہ سب لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

امیر المؤمنین نے پہلے شخص سے دریافت فرمایا کہ تو نے اقبالِ جرم کیوں کیا تھا؟ اس نے کہا: "میں قصاب ہوں۔ رات کے آخری حصے میں اپنی دوکان سے باہر نکل کر

سنہ کنز العمال جلد پنجم صفحہ ۳۴ مطبوعہ حیدر آباد دکن۔

گائے کو ذبح کیا تھا، ہاتھ میں چھری تھی، پیشاب نے زور کیا، تو اسی حالت میں فراغت کو گیا۔ واپس ہو رہا تھا، تو یہ مقتول گلی میں خون آلود پڑا تھا۔ لوگوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا اور گرفتار کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں تو خاموشی سے اس ناکردہ جرم کا اعتراف کر لیا۔"

دوسرے شخص نے کہا "میں بہت مفلس ہوں۔ مال حاصل کرنے کے لیے میں نے یہ قتل کیا تھا۔ جب لوگ گلی کی طرف آنے لگے تو میں فرار ہو گیا۔ آپ نے قصاص کا حکم صادر فرمایا، تو مجھے خوف ہوا کہ میری گردن پر دو قتلوں کا بوجھ پڑے گا۔ اس لئے میں نے آکر حق بات بتا دی۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے رائے طلب کی تو آپ نے فرمایا "اگرچہ اس شخص نے ایک قتل کیا ہے لیکن ساتھ ہی دوسرے کی جان بھی بچائی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے ایک نفس کو موت سے بچایا، گویا اس نے ساری انسانیت کو موت سے بچا لیا۔" اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فیصلہ صادر فرمایا کہ "دونوں ملزموں کو رہا کر دیا جائے اور مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کر دی جائے۔ [۱۱]

ایک، دوسرے مقدمے کی تفصیلات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔ ایک ملزم پر چوری کا الزام تھا۔ آپ نے اسے قید کر دیا۔ اور دوسرے روز گواہوں کے ساتھ طلب فرمایا۔ معلوم ہوا کہ ایک گواہ بھاگ گیا ہے۔ آپ نے چور کو رہا کر دیا اور اسے کوئی سزا نہ دی۔ جب تک دو گواہ پیش نہ ہوتے، آپ حد کی شرعی سزا نافذ نہیں کرتے تھے۔ اور جب گواہ انکار کر دیتے تو آپ ملزموں کو سزا

---

[۱۱] الطرق الحکمۃ۔ از علامہ ابن قیم مطبوعہ مصر صفحہ ۳۰

دیئے بغیر رہا کر دیتے تھے۔ [۱۲]

زبانی ہتک عزت کے ازالے کے ایک مقدمے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ اگر کسی شخص نے کسی کو کافر یا خبیث یا فاسق یا گدھا کہا تو اس جرم کے کے لیئے کوئی شرعی حد مقرر نہیں ہے۔ مسلمان حکمران اپنی صوابدید کے مطابق مقامی حالات کے مطابق تعزیری سزا دے سکتا ہے۔ [۱۳]

قاضی کی قابلیت اور دوسری صفات کے تعین کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مفصل خط کا متن صفحات سابقہ میں گزر چکا ہے جو آپ نے قاضی مقرر کرنے کے لیئے مصر کے والی کو لکھا تھا اور جس میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ "صرف ایسے شخص کو قاضی مقرر کیا جائے جو ہر لحاظ سے تمام رعایا میں بہتر شخصیت کے مالک ہوں"۔

مختصر یہ کہ خلافت راشدہ کے باسعادت دور میں عدالتی نظام، عہد رسالتؐ کے عدالتی نظام کا مکمل نمونہ تھا۔ مساوات اسلامی کے اصول کی اس سختی سے پابندی کی جاتی تھی کہ خود خلیفۂ وقت رعایا کے ایک عام فرد کی طرح عدالت میں حاضر ہوتا۔ اور اگر ان کا کوئی قریبی رشتہ دار کسی جرم کا مرتکب ہوتا تو اسے عام لوگوں کی نسبت سخت سزا دی جاتی۔ تاہم اس عہد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام میں پہلی دفعہ جیل خانوں کا آغاز کیا اور اس مقصد کے لئے آپ نے مکۃ المکرمۃ میں صفوان بن امیہ کا مکان چار ہزار درہم میں خرید لیا تھا۔ دوسرا اضافہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تھا کہ انہوں نے عدالتی نظام کے لئے علیحدہ

---

[۱۲] کنز العمال جلد دوم صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ حیدر آباد دکن۔

[۱۳] " " " ۴۴۱ " " "

عمارتیں بنوائیں جو دار القضاء کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان دونوں ادوار میں ایک فریق اپنا مقدمہ پیش کرتا اور جس کے خلاف دعویٰ کیا جاتا وہ اپنی صفائی پیش کرتا۔ ان دو فریقوں کے علاوہ کسی تیسرے فریق کو ان کی وکالت کرنے کی اجازت نہ تھی۔

قاضیوں کی تنخواہ

اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عدالتی نظام کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا۔ اور مختلف شہروں کے لئے قاضی مقرر کر کے ان کے معقول مشاہرے مقرر کئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ قاضیوں کو زیادہ سے زیادہ تنخواہ دیں۔ لیکن اس دور کے اکثر قاضیوں پر تقویٰ اس قدر غالب تھا کہ انہوں نے اپنی ضروریات سے کچھ زیادہ لینا گوارا نہ کیا۔ آپ نے قاضی سلیمان بن ربیعہ باہلی کی تنخواہ پانچ صد درہم مقرر کی جو اس زمانے میں خاصی رقم تھی۔ جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایک بھیڑ یا بکری کی قیمت دو تین درہم سے زیادہ نہ ہوتی ہوتی تھی۔ اس کے مقابلے میں اسلام کے سب سے مشہور قاضی حضرت شریح بن حارث الکندی نے صرف ایک صد درہم ماہانہ معاوضہ لینا قبول فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا درجہ زہد و قناعت میں بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ لیکن قاضیوں کی تنخواہیں آپ نے بھی کافی مقرر کیں۔ آپ نے عامل مصر کو قاضی مقرر کرنے کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے لکھا تھا کہ جب تم کسی شخص کو قضاء کا عہدہ تفویض کرو تو اس کی تنخواہ کافی مقرر کرو۔ تاکہ اس کے اخراجاتِ زندگی اسے رشوت لینے پر مجبور نہ کریں۔ آپ نے قاضی شریح بن حارث کی تنخواہ بڑھا کر پانچ صد درہم ماہانہ کر دی۔ تاکہ ان کا معیار دوسرے قاضیوں کے برابر ہو جائے۔ اس کے برعکس خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بیت المال سے

صرف اتنا گزارہ الاؤنس لیتے تھے جس سے ان کی دو وقت کی روٹی کا سامان مہیّا ہوتا تھا۔ آپ کے عہد کے قاضیِ مصر عبدالرحمن بن حجرۃ الخولانی کو دو سو دینار ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ ایک دینار دس درہم کے برابر ہوتا تھا۔ مصر میں بیت المال اور قصاص وغیرہ کا انتظام بھی انہی کے سپرد تھا، اور اس اضافی کام کے لیئے انہیں چار صد دینار علیحدہ تنخواہ ملتی تھی۔ کندی نے اپنی مشہور تاریخ جو ان کے نام کی وجہ سے تاریخ کندی کے نام سے مشہور ہے؛ میں لکھا ہے کہ مجھے مروان بن محمد کے زمانے کے ایک رجسٹر میں ایک دستاویز ملی، جس میں عیسیٰ بن ابی عطا نے بیت المال کے خزانچی کو لکھا تھا کہ قاضی عبدالرحمن بن سالم کو ان کی تنخواہ مبلغ بیس دینار بابت ماہ ربیع الاوّل اور ربیع الثانی ۱۳۱ھ ادا کر دی جائے اور اس کا اندراج رجسٹر میں کر لیا جائے۔ اس سرکاری دستاویز پر ۱۰ ربیع الاوّل ۱۳۱ھ کی تاریخ درج ہے۔

اس دَور کے مشہور قاضی

حضرت شریحؒ بن حارث الکندی

اس دَور کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ جب تک کہ اس دور کے مشہور قاضی حضرت شریحؒ بن حارث الکندی کا مفصل تعارف نہ کرا دیا جائے۔ فقہ کی کتابوں میں آپ کے جو فیصلے منقول ہیں، انہیں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ آپ نے اُمّتِ مسلمہ میں سب سے زیادہ لمبی مدت کے لیئے قاضی کے فرائض سرانجام دیئے۔ کچھ روایات کے مطابق یہ مدّت ساٹھ سال تھی۔ جبکہ بعض دوسری روایات کے مطابق پورے بہتّر[۷۲] سال۔ علامہ محمّد الخضری نے تاریخ التشریع الاسلامی میں ان کے حالات نہایت ہی مختصر بیان کیئے

ہیں۔ تاہم قاضی ابن عرنوس نے اپنی مشہور کتاب تاریخ القضاء فی الاسلام میں ان سے انصاف کیا اور ہم وہیں سے ان کے حالاتِ زندگی نقل کرتے ہیں:۔

"آپ کا پورا نام شریح بن حارث الکندی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو قاضیوں کے مقرر کرنے میں والیوں کے تقرر کی نسبت بھی زیادہ احتیاط سے کام لیتے تھے، نے آپ کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا تھا۔ آپ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں اس عہدے پر برقرار رکھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں جب اسلامی حکومت غیر یقینی حالات سے دوچار تھی، انہیں کچھ عرصے کے لئے معزول کر دیا گیا تھا۔ تاہم جب حجاج بن یوسف کوفہ کا گورنر ہوا تو آپ نے اس کے مظالم کے خلاف احتجاج کے طور پہ اپنا استعفےٰ پیش کر دیا۔ آپ کا شمار کبّار تابعین میں ہوتا تھا۔ آپ نے ۷۸ھ اور ۸۰ھ کے درمیان وفات پائی۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔"

کتاب النجوم الظاہرۃ میں ۷۵ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے:۔

"اسی سال کوفہ کے قاضی ابوامیہ حضرت شریح بن حارث بن قیس بن جہم بن معاویہ بن عامر نے وفات پائی۔ آپ کا شمار کوفہ کے تابعین کے طبقہ اولیٰ میں ہوتا ہے۔ بعض مورخین کا دعویٰ ہے کہ انہیں صحابیٔ رسول ﷺ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔"

اسماء الرّجال کی ایک دوسری کتاب شذرات الذہب میں لکھا ہے:۔

"قاضی شریحؒ کی وفات ۷۸ھ میں اور ایک دوسری روایت کے مطابق ۸۰ھ میں ہوئی۔ انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفے

کا قاضی مقرر کیا تھا۔ اور آپ تین سال کے قلیل عرصے کے سوا مسلسل پچھتّر سال تک اس عہدے پر فائز رہے ۔ ابن قتیبہ کے بیان کے بموجب ایک سو بیس برس عمر پائی ۔ وفات سے ایک سال قبل آپ نے حجاج بن یوسف والیٔ عراق کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ یہ بہت بڑے فقیہہ ، زیرک ، شاعر اور پُر مذاق شخص تھے۔ قضاء کے معاملے میں تو انہیں بہت ہی کمال حاصل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے انہیں اس عہدے کے لئے منتخب کرنے کا واقعہ سابقہ سطور میں گزر چکا ہے ۔ علّامہ ابن قیم نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں قاضی شعبی کے متعلق ایک روایت درج کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شریح بن حارث کو کوفے کا قاضی بنا کر بھیجا۔ تو انہیں اسلام کے عدالتی نظام کے بارے میں چند ہدایات بھی دیں ۔ آپ نے فرمایا ؛۔

"جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو سب سے پہلے کتابُ اللہ پر نظر دوڑاؤ۔ اگر اس میں کوئی واضح حکم مل جائے تو اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر کتابُ اللہ میں کوئی حکم نہ ملے ، تو سُنتِ نبوی ؐ کی پیروی کرو۔ اگر سنت بھی اس معاملے میں خاموش ہو ، تو پھر اجتہاد سے کام لو اور اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کرو۔" [۱۴]

یہ ہدایات آپ نے نہ صرف زبانی دیں بلکہ اس مضمون کی ایک تحریر بھی لکھ کر ان کے حوالے کی ۔

---

[۱۴] تاریخ القضاء فی الاسلام از ابن عرنوس صفحہ ۳۱-۳۲ مطبوعہ مصر ۔

قاضی شریحؒ بہت زیرک معاملہ فہم اور ذہین و فطین انسان تھے۔ بہت کم لوگ انہیں دھوکہ دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت نے کئی شرعی مسائل میں گڑبڑ کی کوشش کی۔ لیکن آپ نے انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور آج کل کی اصطلاح میں ہر وقت اپنا استعفیٰ اپنی جیب میں رکھتے تھے۔ ملوکیت کے دور میں جب اوقاف کا وجود ہوا تو آپ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح انہیں خلافِ اسلام قرار دے دیا۔

علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب "الطرق الحکمیۃ" میں ایسے کئی واقعات درج کئے ہیں، جن سے ان کی کمالِ ذہانت اور فطانت کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ کا ذکر کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ قاضی شعبی جو اسی دور کے دوسرے مشہور قاضی تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ شریحؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت اپنے خاوند کے خلاف شکایت لے کر ان کی عدالت میں حاضر ہوئی۔ اپنا بیان دیتے ہوئے اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ مجھ پر اس کی آہ و بکا کا بہت اثر ہوا، اور میں نے قاضی شریحؒ سے کہا: "اے ابو امیہ! اس عورت کے رونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ یقیناً مظلوم ہے، اور بے کس ہے"۔ میری یہ بات سن کر قاضی شریحؒ نے فرمایا:-

"اے شعبی! یوسفؑ کے بھائی بھی انہیں کنوئیں میں ڈالنے کے بعد اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے تھے"!

قاضی شریحؒ بہت ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھے اور اپنے عدالتی فیصلوں میں بھی اسی زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔

ایک مرتبہ عدی بن ارطاۃ نے آپ کی عدالت میں حاضر ہو کر مندرجہ ذیل گفتگو کی:-

عدی : میں شام سے آیا ہوں۔
قاضی شریح : واقعی آپ بہت دور سے آئے ہیں۔
عدی : یہاں آکر میں نے شادی کر لی ہے۔
قاضی شریح : بہت اچھا کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مال و دولت اور اولاد سے نوازے۔
عدی : اب میں واپس اپنے علاقے کو جانا چاہتا ہوں۔
قاضی شریح : انسان کو اپنے اہل و عیال کا بھی خیال کرنا چاہیئے۔
عدی : میں نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ اس کا گھر آباد رکھوں گا۔
قاضی شریح : انسان کو اپنے وعدے کا لحاظ کرنا چاہیئے۔
عدی : آپ ہمارے درمیان فیصلہ کرا دیں۔
قاضی شریح : میں نے پہلے ہی فیصلہ کرا دیا ہے۔

اس فیصلے سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس دور میں دورِ نبوی ﷺ کی طرح مقدمات کے فیصلے فوری ہوتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ ہی ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں۔

ساتواں باب

اموی دور کا عدالتی نظام

اس دور کی مختصر سیاسی حالت

اس دور کی ابتدا اس وقت سے ہوئی ہے جب عامۃ المسلمین نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت پر اتفاق کر لیا تھا۔ اسی بنا پر ہجرت کے اکتالیسویں سال کو عام الجماعۃ یعنی جماعت کا سال کہا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک مسلمانوں کے دو گروہوں کے سیاسی اختلافات کا پوری طرح خاتمہ نہیں ہوا تھا، بلکہ کچھ لوگ ایسے رہ گئے تھے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ اب یہ مخالفین بھی دو گروہوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ان میں سے پہلا گروہ خارجیوں کا تھا، جو اپنے سیاسی اصولوں کی وجہ سے اسلام میں ملوکیّت کے سخت خلاف تھا۔ اس کے نزدیک خلافتِ اسلامیہ کسی خاص خاندان یا کسی خاص شخص کی ذات میں محدود نہ تھی۔ بلکہ اس کا دار و مدار جمہور کے ارادے پر تھا، اور وہ اپنی سیاست اور حکومت کے لئے خود موزوں شخص کا انتخاب کر سکتے تھے۔ یہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضؓ تینوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سیاست سے اختلاف کیا اور اپنے خاندان والوں کی رعایت اور عزت افزائی کی۔ اور قومی حقوق میں انہیں ترجیح دی، اور حضرت علی رضؓ نے اپنے اور اپنے مخالفین کے درمیان ثالثی پر رضامندی ظاہر کی۔ اور ان کے خیال کے مطابق حضرت امیر معاویہ رضؓ

نے خلافت کے منصب پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ دوسرا گروہ شیعانِ علیؓ کا تھا۔ جو خلافت کے منصب کو حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کا حق سمجھتا تھا۔ اس لیئے جس شخص نے ان کے اس حق کو غصب کیا وہ ان کے نزدیک ظالم تھا۔ اور وہ اس کی حکومت کو جائز تسلیم نہیں کرتے تھے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے سیاسی طرزِ عمل نے شیعانِ علیؓ کے مخالفانہ خیالات کو پُر سکون بنا دیا تھا اور خارجیوں کی سختیاں کم کر دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دَور میں تو امن و امان قائم رہا، لیکن ان کی وفات کے بعد ہی اتحادِ اسلامی کے خلاف شورشیں برپا ہونے لگیں۔ چنانچہ اہلِ مدینہ نے ان کے جانشین یزید کی بیعت فسخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اس خیال سے عراق کا رخ کیا کہ وہاں آپ کے باپ کے حامیوں میں سے ایسے اشخاص مل جائیں گے جو ان کے غصب شدہ حق کی واپسی میں ان کی مدد کریں گے۔ ادھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں پناہ گزیں ہو کر یزید کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ گڑبڑ کے ان واقعات نے اہلِ مدینہ کو بہت پریشان کیا اور اس کے نتیجے میں ان پر سخت آفتیں نازل ہوئیں۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ حدودِ عراق میں داخل ہونے سے پہلے ہی شہید کر دیئے گئے اور ان کے اہلِ بیعت میں سے بہت سے افراد نے اہلِ عراق کے درمیان شہادت پائی۔ اور اگر اسی عرصے میں یزید فوت نہ ہو گیا ہوتا تو مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا بھی یہی حشر ہوتا۔

یزید کی موت کے بعد فتنہ و فساد کی یہ آگ مزید بھڑک اٹھی اور جب تک عبدالملک بن مروان نے مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو شکست نہ دے دی، اور وہ تمام علاقے اپنے قبضے میں نہ کر لئے جو گڑبڑ کے مرکز تھے۔ تب تک

یہ آگ بڑی شدت سے بھڑکتی رہی۔ لیکن حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت اور گڑبڑ والے علاقوں کی واپسی کے بعد اب دوبارہ مسلمانوں میں اتفاقِ عام پیدا ہونا شروع ہوا، اور شیعوں کی دعوت اور خوارج کی شدت زائل ہوگئی۔ تاہم جو اتفاق حضرت امیر معاویہ رضؓ کی ذات پر تمام مسلمانوں کا ہوا تھا، اس سے یہ اتفاق قدرے مختلف تھا۔ امیر معاویہ رضؓ نے اس اتفاق کو رفق ملاطفت اور حسنِ معاملت کے ذریعے محفوظ رکھا تھا۔ لیکن عبدالملک بن مروان نے اس کی بنیاد بالکل قوت پہ قائم کی تھی۔ کیونکہ اس نے مرکزِ فساد میں حجاج بن یوسف پر اعتماد کیا تھا۔ جو ان مستبدین کا امام تھا جو جبر و اقتدار کے ذریعے اتحاد و اتفاق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ جس کا اثر دیرپا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث الکندی کے زیرِ اثر حکومت کے خلاف ایک عظیم شورش پیدا ہوئی۔ اگر شام کی جانب سے پے در پے کمک جس نے سخت جدوجہد کے بعد اس شورش کا خاتمہ کر دیا تھا نہ پہنچتی رہتی، تو اس نے بنی امیہ کے اقتدار کا تقریباً خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی طرح حجاج کو خوارج سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اگر مہلب بن ابی صفرہ کی ہمت شاملِ حال نہ ہوتی اور خارجیوں میں فرقہ بندی نہ ہوگئی ہوتی، تو ان کا معاملہ بھی نہایت سخت ہوجاتا۔ ان تمام مصائب کے خاتمے کے بعد ولید بن عبدالملک کا دَور آیا جو حکومتِ بنوامیہ کا سب سے روشن اور خوشگوار دَور تھا۔ اس دَور میں فتنہ و فساد کا خاتمہ ہوگیا۔ اور مشرق و مغرب میں عظیم الشان فتوحات کا سلسلہ قائم ہوا، لیکن جس طرح آندھیوں کے سخت جھکڑوں کے بعد سکون پیدا ہوجاتا ہے، اسی طرح یہ سکون بھی عارضی اور وقتی تھا۔ ولید کے بعد اس کے بھائی سلیمان بن عبدالملک کا دَور آیا، اور اس نے سپہ سالارانِ سلطنت یعنی قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم اور موسیٰ بن نصیر

کے ساتھ جنہوں نے مشرق و مغرب میں اس سلطنت کے اقتدار کو پھیلایا تھا، بدسلوکی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اُن قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے دل سلیمان بن عبدالملک سے صاف نہ رہ سکے۔

سلیمان بن عبدالملک نے اپنے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا خلیفہ بنایا۔ جنہوں نے لوگوں میں عدل و مساوات پھیلایا۔ اور ان کے اسلاف کے قبضے میں جو اراضی اور دوسری چیزیں تھیں انہیں مظالم قرار دیتے ہوئے واپس لے کر بیت المال میں داخل کر دیا۔ خلافت کے متعلق ان کی رائے خوارج کی رائے سے بہت کچھ مشابہت رکھتی تھی۔ کیونکہ انہوں نے اسے اپنے خاندان سے نکالنے کی کوشش کی اور اس کا اہل اس شخص کو قرار دیا، جو علم اور دین کے لحاظ سے اس کے لئے موزوں تر ہو۔ لیکن ان کی موت نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی۔ جس کی وجہ سے یہ اہم تبدیلی غیر مکمل رہ گئی۔

ان کی نرمی اور چشم پوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے عہد میں دوسری صدی کے آغاز میں بنوعباس کی مخفی دعوت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ یزید بن عبدالملک ان کا جانشین ہوا، اور اس کے بعد اس کا بھائی ہشام بن عبدالملک اس کا خلیفہ ہوا، جس کے زمانے میں زید بن علی بن الحسین نے اپنے لئے خلافت کا مطالبہ کیا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور شہید کر دیئے گئے۔ ان کے بعد ان کے فرزند یحییٰ بن یزید کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ مختصر یہ کہ ہشام کے دَورِ حکومت میں عباسی خاندان کی مخفی دعوت نے جس نے آخیر میں سلطنت بنوامیہ کا خاتمہ کر دیا، نشوونما پائی۔

اموی عدالتی نظام کی خصوصیات

اس دَور میں سیاسی طور پر اگرچہ کافی گڑبڑ رہی ہے لیکن

اسلامی معاشرہ ابھی تک خالص عربی ہونے کی وجہ سے سادگی کا دلدادہ تھا۔ اور اہلِ تقویٰ لوگوں کی کمی نہ تھی ۔ لوگ اپنے تنازعات اب بھی زیادہ تر دین کا علم رکھنے والے حضرات کے پاس شرعی رائے معلوم کرنے کے لئے لے جاتے تھے، اور پھر اس پر دونوں فریق خاموشی سے عمل کرتے تھے ۔ تاہم بعض معاملات پیچیدہ نوعیت کے ہوتے تھے، جن کا فیصلہ صرف قاضی ہی کر سکتے تھے ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کوشش کی تھی کہ بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ منورہ سے باہر نہ جانے دیا جائے ۔ اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ مسائل میں اختلاف بہت کم پیدا ہوا اور قاضیوں کا کام اتنا مشکل نہ ہوا تھا۔ کیونکہ اگر کسی مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوتا، تو دوسرے شہروں کے اہلِ علم مدینہ منورہ تشریف لاکر اس مسئلہ کو صاف کرا لیتے ۔ اور چونکہ تمام کبار صحابہ رضؓ ایک ہی جگہ موجود ہوتے تھے، اس لئے ایسے مسائل کے بارے میں بہت کم اختلاف پیدا ہوتا ۔ اور پھر قاضی حضرات ان شرعی فیصلوں کی روشنی میں اپنے احکام صادر کر دیتے تھے ۔

لیکن اموی دَور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر باہر نکلنے کی پابندی ختم کر دی گئی اور وہ بڑے بڑے اسلامی شہروں میں پھیل گئے ۔ چنانچہ مدینہ منورہ سے نکل کر بعض صحابہ کرام رضؓ نے معلّم اور بعض نے قاری کی حیثیت سے دوسرے اسلامی شہروں میں سکونت اختیار کر لی ۔ یہاں تک کہ یہ نئے شہر ان کے اصل وطن کی حیثیت اختیار کر گئے اور ان کی تعلیم و ارشاد کے ذریعے سے کبار تابعین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی جو فتویٰ میں ان کی شریک ہو گئی اور زیادہ تر قاضی اسی تابعین کی جماعت سے ہی مقرر ہوتے تھے ۔ تاہم

اس دَور کے قاضیوں کے لیئے تنازعات کا فیصلہ کرنا، اتنا آسان نہ رہا۔ جتنا کہ وہ خلفائے راشدین کے دَور میں تھا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو روایت کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ لیکن اب یہ رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ فتوحات کی وجہ سے تمدّن میں وسعت نے بہت سی نئی ضروریات پیدا کر دی تھیں۔ جس کے بارے میں شرعی احکامات متعین کرنے کیلئے تحقیق وجستجو سے کام لینا پڑا۔ مختلف شہروں میں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گئے، تو وہاں کے لوگوں نے اُن سے احادیث روایات کیں، اس لئے بعض اوقات ایسا اتفاق ہوا کہ ایک حدیث جو ایک شہر میں روایت کی گئی، وہ دوسرے شہروں کے لوگوں کو نہ مل سکی، جس کی وجہ سے بعض تنازعات کے سلسلے میں شرعی آراء کے بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف شیعہ اور خوارج نے صرف انہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے احادیث روایت کیں، جو ان کے مزاج کے زیادہ قریب تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف طبقات کے لئے الگ الگ فتاوی پیدا کر دیئے گئے۔ جو باہم ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ تاہم ان مختلف طبقات میں دو گروہوں نے ممتاز حیثیت حاصل کی۔ ایک اہل حدیث علماء اور دوسرے اہل رائے فقہاء۔ اہل حدیث صرف ظاہری نصوص سے غرض رکھتے تھے۔ اور ان کے عِلل واسباب پر بحث جائز نہیں سمجھتے تھے، اور اپنی رائے سے بہت کم فتوے دیتے تھے۔ اس لئے اس گروہ کے زیرِ اثر لوگوں کو جب صحیح احادیث نہیں ملتی تھیں، تو ان میں کچھ لوگ نیک خواہشات کی بنا پر، یا اپنی خود غرضی کے لئے ضعیف احادیث گھڑ لیتے تھے۔

عدالتی فیصلے اجتہاد کی بجائے حدیث پر

اہلِ حدیث کے مقابلے میں اہل رائے کا گروہ تھا جو فقہاء

کے نام سے مشہور ہوئے ۔ یہ لوگ شرعی احکامات کے علل واسباب کا سراغ لگاتے تھے ۔ اصول کے ذریعے باہم مسائل کی شیرازہ بندی کرتے تھے ۔ اور جب انہیں کوئی حدیث نہیں ملتی تھی تو اپنی رائے سے فتویٰ دینے میں انہیں کوئی تامل نہ تھا ۔ جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے اکثر اہلِ حجاز اہلِ حدیث تھے جبکہ اہلِ عراق کا شمار اہل الرائے میں ہوتا تھا ۔

فقہائے عراق میں سے جن لوگوں نے رائے اور قیاس میں شہرت حاصل کی، ان میں ابراہیم بن یزید النخعی الکوفی فقیہہِ عراق بہت شہرت رکھتے تھے ۔ وہ حضرت امام ابوحنیفہ کے استاد حماد بن ابی سلیمان کے استاد تھے ، اور اپنے ماموں علقمہ بن قیس النخعی الکوفی سے جو طبقۂ اولیٰ کے قدماء ، فقہائے تابعین تھے ۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے برگزیدہ شاگردوں میں سے تھے ۔ فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی ۔ آپ کوفے کے محدّث اور عالم حضرت عامر بن شراحیل الشعبی کے معاصر تھے ۔ جنہیں قاضی کا عہدہ سونپا گیا تھا ۔ لیکن دونوں کی حالتیں بالکل الگ الگ تھیں یعنی عامر شعبی کٹر اہلِ حدیث تھے اور جس مسئلہ میں انہیں کوئی حدیث نہ ملتی تھی ، اس کے متعلق فتویٰ یا فیصلہ دینے سے ہچکچاتے تھے اپنی رائے سے کوئی فیصلہ دینے کو مکروہ سمجھتے تھے ۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے فرمایا کہ اگر احنف بن قیس ، جو عرب کا بہت بڑا باحوصلہ اور عاقل شخص تھا ، کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ قتل کر دیا جائے ، تو آیا ان دونوں کی دیت برابر ہوگی ، یا عقل وحلم کی بناء پر احنف کو ترجیح دی جائے گی ۔ ؟ اہل الرائے یعنی فقہاء نے فتویٰ دیا کہ دونوں کی دیت برابر ہوگی ۔ تو بولے پھر قیاس کوئی چیز نہیں ۔ اس واقعہ کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس دَور میں اگرچہ فقہائے نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی ۔ لیکن عدالتی نظام کے لئے اموی خلفاء عام طور پر اہلِ حدیث اہلِ علم کو ترجیح دیتے تھے ۔ جیسا کہ خود کوفے

میں جو اہلِ رائے فقہاء کا مرکز تھا، وہاں پر بھی اہل الرائے کے سردار ابراہیم نخعی کے مقابلے میں اہلِ حدیث عالم دین امام شعبی کو ترجیح دی گئی۔ جو اہل رائے کے اس مرکز میں بیٹھ کر ان کے مسلک کی مذمت کیا کرتا تھا۔ ان کی اس اہمیت کے پیش نظر اس باب کے آخر میں ان کے حالاتِ زندگی پیش کیے جائیں گے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کی کوشش

اہل حدیث کی اس سرکاری سرپرستی کے باوجود لوگ اہلِ رائے فقہاء کی طرف رجوع کرنے لگے۔ چنانچہ ان لوگوں کو روکنے کے لئے ضعیف احادیث گھڑی گئیں۔ جن سے اہلِ حدیث علماء کا پلہ اور کمزور ہو گیا۔ اس صورتِ حالات کو دیکھ کر اس وقت کے خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبد العزیز نے صحیح احادیث کی تدوین کی طرف توجہ کی۔ تاکہ عامۃ النّاس جاہل لوگوں کے پھندوں میں نہ پھنس جائیں۔ آپ نے چالیس روز تک استخارہ کرکے یہ تاریخی فیصلہ کیا، اور مدینہ منورہ میں اپنے نائب ابوبکر محمد بن حزم کو احادیثِ رسول ؐ جمع کرنے کی اجازت دی۔ انہوں نے مجموعہ تیار کیا۔ اس کی نقلیں کروا کر مختلف شہروں میں سرکاری عاملوں کو بھجوا دی گئیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز بنو امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور مصر میں نشو و نما پائی۔ آپ نے حضرت انس بن مالک اور بہت سے تابعین سے حدیث روایت کی۔ آپ امام، فقیہہ، مجتہد، ماہرِ حدیث، حافظِ قرآن، اور مستند حجت تھے۔ عدل و انصاف میں آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مثل، زہد میں حضرت حسن بصری ؒ کی نظیر اور علم میں امام زُہری ؒ کے ہمسر تسلیم کیے جاتے تھے۔ امام مجاہد فرماتے ہیں کہ وہ انہیں تعلیم دینے کے لئے آئے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کے شاگرد بن گئے۔ آپ نے ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

آپ کا طبعی رجحان اگرچہ اہلِ حدیث علماء کی طرف تھا اور اموی دور کی روایات کے مطابق انہی سے قاضی مقرر کئے۔ تاہم آپ نے ان کے لئے لازم قرار دیا کہ قاضی بننے کے بعد وہ اہلِ رائے فقہاء سے میل جول رکھیں۔ آپ سے پہلے اموی دور میں کسی اہلِ رائے فقیہہ کو قضاء کا عہدہ نہیں سونپا گیا تھا۔ لیکن حدیث کا ایک بہت بڑا عالم ہونے کے باوجود آپ نے ان حضرات کی ممکن حد تک حوصلہ افزائی فرمائی۔ چنانچہ آپ نے قاضی منتخب کرنے کے لئے جو پانچ خصوصیات لازمی قرار دیں، ان میں بھی اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔

یہ خصوصیات مندرجہ ذیل تھیں :۔

۱۔ قاضی کو اپنی تقرری سے پہلے کے واقعات کا علم ہو۔

۲۔ اسے حرص و لالچ سے نفرت ہو۔

۳۔ بردبار ہو۔ اور مخالف کے ساتھ بھی تحمل سے پیش آئے۔

۴۔ آئمہ فقہ کا متبع اور پیروکار ہو۔

۵۔ اہلِ علم اور اصحاب رائے کے ساتھ میل جول رکھتا ہو۔

اجتہاد سے غفلت کا خاتمہ

عہدۂ قضاء کے لئے اہلِ حدیث کو ترجیح دینے کی وجہ سے قاضی حضرات اجتہاد سے غفلت برتنے لگ گئے تھے۔ کیونکہ اکثر مسائل میں اہلِ رائے حضرات سے انہیں سخت اختلاف تھا بلکہ اکثر وہ ان کی مذمت کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ حدیث قاضیوں نے اجتہاد سے غفلت برتنی چھوڑ دی۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے دور کی طرح اس دور میں بھی کسی نہ کسی درجے میں اجتہاد سے کام لیا جاتا رہا۔ تاہم نہ تو قاضی اور نہ ہی عوام کسی مخصوص فقہی امام کے پابند ہوتے تھے۔ اس لئے جس مفتی یا فقیہہ کی رائے کو وہ اسلامی

تعلیمات سے زیادہ قریب سمجھتے تھے، اپنے فیصلوں کا دار و مدار اس پر رکھتے تھے۔

خود حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو اہل حدیث ہونے کے باوجود فقہ کا بھی امام سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ کے دور کے قاضی اکثر اہم مقدمات میں آپ کی رائے معلوم کرتے رہتے تھے۔ مثلاً مصر کے قاضی عیاض بن عبد اللہ ازدی نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو لکھا کہ پہلے حق شفعہ قریب ترین پڑوسی کو حاصل ہوتا تھا۔ اور وہ نہ لینا چاہے تو اس سے قریب کے پڑوسی کو یہ حق ملتا تھا۔ موجودہ حالات میں کیا عمل کرنا چاہیئے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب میں لکھا کہ اب شفعہ کا حق صرف شریک کو حاصل ہے۔ لوگوں نے اپنے مکانوں اور زمینوں میں داخل ہونے کے لیئے علیحدہ علیحدہ راستے بنا لیئے ہیں۔ تو پھر انہیں حق شفع کیوں دیا جائے۔

ایک مرتبہ ایک عورت کسی گھوڑے کی جھپٹ میں آکر ہلاک ہوگئی۔ لیکن گھوڑے کے مالک نے عورت کے وارثوں کو کسی قسم کا ہرجانہ دینے سے انکار کر دیا۔ قاضی عیاض نے یہ واقعہ لکھ کر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے جواب لکھ کر بھیجا کہ گھوڑے کے مالک کو یقیناً ہرجانہ دینا پڑے گا۔ اسی طرح اور بھی کئی مقدمات کے بارے میں قاضی عیاض نے آپ کی رائے دریافت کی۔ مورخ الکندی نے ان تمام واقعات کی تفصیل قاضی عیاض کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں بیان کی ہے۔

خلاصۂ بحث

مختصر یہ کہ اس دور میں اگرچہ شریعتِ اسلامی کے معاملات میں قیاس اور رائے کو عروج حاصل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور فتوحات کی وجہ سے تمدّن میں وسعت پیدا ہو کر نئے نئے مسائل اٹھ

آ گئے تھے، تاہم خلفائے بنوامیہ میں ابھی تک عربوں کی روایتی سادگی کا غلبہ تھا۔ اس لئے انہوں نے قاضی مقرر کرتے وقت علمائے فقہ کی بجائے علمائے اہلِ حدیث کو ترجیح دی۔ اس تخصیص کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے پہلے مختلف فیصلوں میں قاضی، جو اجتہاد سے کام لیتے تھے، تو وہ کسی حد تک رک گیا۔ جس کے نتیجے میں اکثر لوگ سرکاری قاضیوں کی بجائے اہل الرائے مفتیوں کے پاس جانے لگے۔ ان کا اثر کم کرنے کے لئے بعض اہل حدیث علماء نے موقع و محل کے لحاظ سے احادیث وضع کرنی شروع کیں۔ جس سے احادیث کے بارے میں کافی اختلاف پیدا ہونے لگا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس معاملے کو بڑے اعتدال سے سلجھایا۔ انہوں نے عامۃ الناس کو جاہل اہل حدیث لوگوں سے بچانے کے لئے احادیث کا ایک مستند مجموعہ تیار کرا کے تمام قاضیوں کو بھجوا دیا۔ دوسرے تمام قاضیوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ اہل رائے فقہاء سے میل جول پیدا کر کے حسبِ ضرورت ان کے فتاویٰ سے بھی استفادہ کریں۔ اس دَور کے سب سے مشہور قاضی امام شعبی کے حالات پیش کرنے پر اکتفاء کیا جائے گا۔ اس زمانے میں ان کی اہمیت اس لئے زیادہ تھی کہ وہ خود تو کٹر اہل حدیث تھے لیکن انہیں فقہاء کے گڑھ کوفہ کا قاضی مقرر کیا گیا تھا۔ اور امام ابوحنیفہ نے آپ سے کسب فیض کیا۔

حضرت عامر بن شراحیل الشعبی علامۃ التابعین

علامہ محمد خضری نے اپنی مشہور کتاب تاریخ تشریع الاسلامی میں آپ کے یہ حالاتِ زندگی بیان کئے ہیں:-

آپ سترہ ہجری (۱۷ھ) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پیدا ہوئے۔ آپ حدیث کے امام و حافظ، فقیہہ اور مختلف علوم کے ماہر

تھے۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کی۔ آپ امام ابوحنیفہؒ کے بھی شیخ تھے اور کوفہ کے قاضی رہ چکے تھے۔ مکحول کہتے ہیں کہ اس نے شعبی سے بڑھ کر کوئی عالم دین نہیں دیکھا۔ ابوحصین کا قول ہے کہ اس نے کسی کو شعبی سے بڑا فقیہہ نہیں دیکھا۔ ابن سیرین نے ابوبکر الہذلی سے کہا کہ شعبی کی صحبت لازم پکڑلو۔ کیونکہ میں نے ان کو دیکھا کہ ان سے فتویٰ لیا جاتا تھا۔ حالانکہ بکثرت صحابہؓ اس وقت موجود تھے۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ شعبی "صاحب الحدیث" اور ابراہیم نخعی "صاحب القیاس" تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ امام شعبی کے پاس سے گزرے اور وہ مغازی کی روایت کر رہے تھے۔ تو فرمایا، میں نے قوم کو دیکھا لیکن یہ مجھ سے زیادہ مغازی کے حافظ اور عالم ہیں۔ امام شعبی سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ پہلے نیک لوگوں نے حدیث کی کثرتِ روایت کو مکروہ سمجھا، مجھے جو کچھ بعد کو معلوم ہوا، اگر پہلے معلوم ہوتا، تو صرف انہی حدیثوں کو روایت کرتا، جن پر اہل حدیث نے اتفاق کر لیا تھا۔ ابن عون کہتے ہیں کہ امام شعبی کے پاس جب کوئی مسئلہ آتا، تو وہ اس سے اجتناب کرتے۔ لیکن ابراہیم نخعی اس کی تفصیل بیان کرتے۔ عام حالات میں امام شعبی شگفتہ رو، اور ابراہیم نخعی ترش رو تھے۔ لیکن جب کوئی فتویٰ آتا تو امام شعبی ترش رو، اور ابراہیم شگفتہ رو ہو جاتے۔ امام شعبی سے روایت ہے کہ ہم لوگ فقہاء میں سے نہیں۔ بلکہ جب حدیث سن لیتے ہیں، تو اسی کو روایت کر دیتے ہیں۔ فقیہہ وہ ہے کہ جب اس کو علم ہو، تو اس پر عمل کرے۔ امام شعبی قیاس کو مکروہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔[1]

---

[1] تاریخ فقہ اسلامی۔ مطبوعہ اعظم گڑھ۔ صفحات ۲۲۸، ۲۲۹

شذرات الذہب کے فاضل مصنف نے ۱۰۴ھ کے واقعات میں امام شعبی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"اس سال علامۃ الدہر، ابو عمرو، عامر بن شراحیل بن معبد الشعبی کی وفات ہوئی وہ قبیلہ حمیر میں سے تھے۔ ان کا نام شعبی اس لئے پڑ گیا کہ ان کے اجداد میں سے ایک شخص سعید نامی یمن کے پہاڑوں میں کسی گھاٹی کے رہنے والے تھے۔ چونکہ شعب کے معنی عربی زبان میں پہاڑ کی گھاٹی ہیں، اس لئے ان کا نام بھی شعبی پڑ گیا۔ وہ دُبلے پتلے شخص تھے، توام پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ولادت حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ہوئی۔ اسّی برس سے زیادہ عمر پائی تھی۔ انہوں نے تقریباً پانچ صد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے قلم نے جو کچھ لکھا، میرے حافظہ نے اسے محفوظ کر لیا۔ اور جو مضامین میرے دل میں آئے، میں انہیں کبھی نہ بھول سکا۔"

اپنے زمانے کے اہل حدیث علماء کا سرخیل ہونے کے باوجود آپ کے تفقہ فی الدین کے لئے، یہ امر کافی سے زیادہ ہے کہ آپ حنفی فقہ کے بانی حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بھی استاد تھے۔ مختصر یہ کہ آپ اس زمانے کے اہل حدیث اسکول اور اہلِ فقہ کی مشترکہ خصوصیات کا عمدہ نمونہ تھے۔

آٹھواں باب

عباسی دَور کا عدالتی نظام

عام طور پر عباسی دور کو اسلام کے عدالتی نظام کا ایک سنہری دَور سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دَور میں تمدن کی بے انتہا وسعت کی وجہ سے دوسرے ممالک کے عدالتی نظاموں کی بنیاد پر اسلام کے عدالتی نظام کو بھی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے ساتھ وسیع پیمانے پر مرتب کیا گیا۔ اس سے اس نظام کی وہ عربی سادگی ختم ہوگئی جو سابقہ ادوار کا خاصہ تھی۔ تمدن کی وسعت کی وجہ سے لوگوں میں مال و دولت کا حرص بڑھتا چلا گیا۔ اور وہ جائز اور ناجائز طریقوں سے اس کے حصول کے پیچھے پڑ گئے۔ اس سے ان میں تقویٰ کی طرف میلان کم ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں قاضیوں کی عدالتوں کی رونق میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہانتک کہ انہیں عوام کو روکنے کے لئے دربان تعینات کرنے پڑے۔ علماء کا طبقہ بھی انہی عوام کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہوتی۔ چنانچہ شرعی احکامات سے بچنے کے لئے مختلف حیلوں کا سہارا لیا جانے لگا۔ عدالتی نظام کی اس توضیح سے پہلے اس دور کی سیاسی حالت پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

اس دَور کی سیاسی حالت

بنوامیہ کے آخری دَور میں ان کے خاندان سے اقتدار چھیننے کے لئے جو خفیہ کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ وہ اس دَور کی ابتداء میں کامیاب ہوگئیں۔ اور خلافت بنو عباس کو منتقل ہوگئی۔ اس تحریک کے سربراہ ابوالعباس عبداللہ نے سفّاح

کے لقب سے بنو عباس کے پہلے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد عباسیوں نے بنو امیہ کے معاملے میں ایسی سختیاں کیں کہ تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ان سختیوں میں ان کے وہ ایرانی مددگار بھی پیش پیش تھے کہ جن کی مدد سے انہوں نے اقتدار حاصل کیا تھا۔

اس وقت بنو امیہ میں سب سے پختہ ارادے کا مالک ایک شہزادہ بھاگ کر اندلس جا پہنچا۔ اور وہاں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جو بنو عباس کے اثر سے بالکل آزاد تھی۔ یہ آزادی اسلامی مرکز کی پہلی تقسیم تھی۔ تاہم اولادِ علی بن ابی طالب کو جو بنو عباس کے چچا زاد بھائی تھے۔ یہ انقلاب پسند نہ آیا۔ کیونکہ وہ خود حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ پختہ عزم کر لیا کہ اس کی خلافت کو یا تو خود حاصل کریں گے۔ یا کم از کم بنو عباس کے لیے اُسے غبار آلود بنا دیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے علویین، ان کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے محمد بن عبد اللہ نے عباسیوں کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے جان نثاروں کے ساتھ سرکاری فوجوں کا خوب مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ انہیں شکست سے دوچار کر دیا۔ اگر ان میں سے چند غلطیاں اور سوء اتفاقیاں، کہ جنہوں نے ان کا خاتمہ مدینے میں اور ان کے بھائی ابراہیم کا بصرے اور کوفے کے درمیان کر دیا۔ نہ پیش آ گئی ہوتیں، تو غالباً وہ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کو ختم کر کے حکومت خود سنبھال لیتے۔

اس کے بعد ابو جعفر منصور کے پوتے موسیٰ الہادی کے عہد میں اطرافِ مکہ میں خاندانِ علویہ کے ایک اور سربراہ جو محمد بن نفس الزکیہ کے نام سے مشہور تھے نے حکومت کے خلاف بغاوت کی، لیکن ناکام ہو کر قتل ہو گئے۔ تاہم اس کا ایک بھائی ادریس بن عبد اللہ اس معرکے سے بھاگ نکلا اور مراکش میں پناہ لے کر وہاں کے

بربروں کی مدد سے حکومت قائم کی ۔ بنو عباس سے الگ یہ دوسری اسلامی حکومت قائم ہو گئی ۔ جو خلافتِ ادریسیہ کے نام سے مشہور ہوئی ۔ اسی طرح اس کا دوسرا بھائی یحییٰ بن عبداللہ اطرافِ مشرق کی طرف بھاگ کر بلادِ دیلم میں جا پہنچا ۔ وہاں بہت سے لوگوں نے اس کی پیروی کی ۔ لیکن عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے فضل بن یحییٰ بن خالد بن برمک کی مدد سے اسے سیاسی چالوں کے ذریعے اس کے قلعہ سے اتار لیا ، اور ایک امن نامہ لکھ دیا ۔ لیکن بعد میں ہارون الرشید نے اس امن نامہ کا خیال نہ کیا اور یحییٰ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔

ان حالات کی روشنی میں خلیفہ ہارون الرشید نے محسوس کیا کہ اس کو ایک ایسی طاقتور حکومت کی سخت ضرورت ہے جو مغرب میں ادریسیوں کی حوصلہ مندیوں کے سامنے ایک دیوار کی طرح حائل ہو جائے ۔ اس لئے اس نے خود افریقہ میں اپنے ہاتھ سے ایک دوسری سلطنت " اغالبہ " کی بنیاد رکھی ۔ اس کے بعد اس کے بیٹے مامون نے خراسان میں اپنے حواری جرنیلوں میں سے طاہریہ خاندان کی امارتِ طاہریہ کو قائم کیا ، اور بلادِ یمن میں امارتِ زیادیہ کا سنگِ بنیاد رکھا ۔ اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مختلف ممالک میں شیعہ فرقہ کی کامیابیوں کو کم کر سکیں ۔

اسی دور میں شیعہ امامیہ نے حضرت امام جعفر الصادق رح کی خلافت پر جو آئمہ شیعہ میں سے چھٹے امام تھے ، اتفاق کر لیا تھا ۔ اور ان کے پیروکار بھی بکثرت تھے ۔ لیکن وہ اپنے لئے خلافت کے خواستگار نہ تھے ۔ جب انہوں نے وفات پائی ، تو ان کے پیروکار دو فرقوں میں منقسم ہو گئے ۔ ایک فرقہ یعنی فرقہ موسویہ نے آپ کے فرزند موسیٰ کاظم رح کو اپنا امام تسلیم کر لیا ۔ اور ان کے بعد امارت کو ان کے لڑکوں اور پوتوں میں بارھویں امام تک لائے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ

امامیہ اثنا عشریہ کہے جاتے ہیں ۔ ان کے بارہویں امام کا نام ابوالقاسم محمد العسکری تھا۔ اور شیعہ امامیہ کا اعتقاد ہے کہ وہ اپنے والد صاحب کی وفات کے بعد ۲۶۰ھ میں چھپ گئے تھے اور آخری زمانے میں ان کا ظہور ہو گا، اور دنیا جس طرح ظلم سے بھر گئی ہے، اسی طرح وہ اسے عدل سے بھر دیں گے، چنانچہ وہ ابھی تک ان کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں۔

دوسرے فرقے نے جو اب اسماعیلیہ کے نام سے مشہور ہے ۔ اسماعیل بن جعفر الصّادق کو اپنا امام تسلیم کر لیا۔ ان لوگوں نے خلافت حاصل کرنے کے لیے جو کوششیں کیں وہ پہلا فرقہ نہ کر سکا۔ ان لوگوں نے اس کام کی ابتدا مخفی طریقہ دعوت سے کی۔ اور اس کے لئے ایسی تعلیمات بنائیں جن کے ذریعے سے بیگانہ دلوں کو مائل کر سکیں ۔ جب ان کا یہ مقصد پورا ہو چکا تو بلادِ افریقہ میں ان کے امام عبیداللہ المہدی کا ظہور ہوا۔ جس سے دولتِ فاطمیہ کی ابتداء ہوئی ۔ اور اس نے تمام مغرب پر تسلّط و اقتدار حاصل کرنے میں عظیم الشان کامیابی حاصل کی اور ابھی اس دَور کا خاتمہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ قاہرہ میں ان کی عظیم الشان اور محفوظ سلطنت قائم ہو چکی تھی۔

خلافتِ عباسیہ کی بنیاد دو عصبیّتوں پر قائم تھی۔ ایک تو عصبیتِ عربیہ جس کا تعلق ان عربوں سے تھا۔ جو خلفائے عباسیہ کے دوست تھے ۔ دوسری عصبیّت فارسیہ، جو دعوتِ عباسیہ کے قائم کرنے والے تھے۔ خلفائے عباسیہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب ان دو فریقوں میں سے کسی فریق سے شبہ پیدا ہوتا تو وہ اس کے مقابل میں دوسرے فریق سے مدد لیتے تھے۔ یہاں تک کہ مامون الرشید نے جس نے خالص ایرانی تربیت پائی تھی اور ایرانیوں ہی کے ذریعے اپنے بھائی محمّد امین پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ یہ مناسب سمجھا کہ وہ عصبیّتِ عربیہ کو مٹا کر اپنی

حکومت کی بنیاد دوسری عصبیّت پر قائم کرے۔ لیکن جب اس کا بھائی اسحاق المعتصم خلیفہ ہوا، تو اس نے اپنے لیئے ترکی غلاموں میں سے جنہیں اس نے بکثرت جمع کر لیا تھا، اپنے لیئے ایک نئی عصبیت قائم کی، جو بعد میں خلافتِ عباسیہ کے خاتمے کا سبب بن گئی۔ خلیفہ المتوکل بن المعتصم نے ان ترکوں سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن ترکوں نے اس کے بیٹے المستنصر کو خلافت کا لالچ دے کر اس کا خاتمہ کر دیا، اور اس طریقے سے المعتصم نے جس اقتدار کے رگ و ریشہ کو قائم کیا تھا، بعد کے تمام خلفاء نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور خلافت کے قریب و بعید دونوں قسم کے لوگوں پر ترکوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔

عدالتی نظام میں وسعت

جیسا کہ اس دَور کے سیاسی حالات کے سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ بہت سے نئے علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آئے، جن میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کی بھی کافی تعداد آباد تھی۔ نئے نئے شہر بس رہے تھے اور تمدّن میں وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ تمدّن میں وسعت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ضروریات میں بھی اضافے ہوتے چلے گئے۔ جنہیں پورا کرنے کے لیئے حرام و حلال کی تمیز ختم ہونے لگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دلوں پر تقویٰ کے اثرات کمزور ہوتے چلے گئے۔ اس لیئے دن بدن تنازعات اور مقدمات میں اضافہ ہونے لگا، جنہیں نپٹانے کے لیئے ہر چھوٹے بڑے شہر میں قاضی مقرر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بڑے بڑے شہروں میں تو مستقل قاضی مقرر کیئے گئے اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں ان کے نائب فیصلے کرنے لگے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں مختلف شہروں میں قاضیوں کا نظام اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ ان کی تنظیم کے لیئے ایک پورا

محکمہ تشکیل دیا گیا۔ اور ایران کے عدالتی نظام کے طرز پر قاضی القضاۃ کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اس کا عہدہ وزیر کے برابر کا ہوتا تھا اور وہ مملکت کے سارے عدالتی نظام کی نگرانی کرتا۔

دولت کی فراوانی کی وجہ سے خلیفہ اور اس کے وزراء اور درباریوں کے محل عیش پرستی کے اڈے بن چکے تھے۔ عیش پرستی ایک ایسی بیماری ہے کہ یہ دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ جب ان بڑے لوگوں کو زیادہ دولت کی ضرورت محسوس ہوئی تو پہلی دفعہ اسلام میں سرمایہ داری نظام کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کی تعریف بیان کرتے ہوئے زمین کی بٹائی کو حرام قرار دے دیا تھا۔ اس زمانے میں زمین کی بےحد و حساب ملکیت ہی سرمایہ داری کی بڑی صورت تھی۔ بٹائی کے حرام ہو جانے کی وجہ سے سرمایہ داری کی یہ بنیاد ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اس دور میں بعض علماء نے زمین کی بٹائی کا فتویٰ دے کر ایک دفعہ پھر سرمایہ داری کا نظام زندہ کر دیا۔

فاسق قاضیوں کی تقرری

حنفی فقہ کے بانی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے دونوں شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ بھی قاضیوں کے لئے انہی شرائط کو لازمی قرار دیتے تھے، جو حضرت عمرؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قاضیوں کے انتخاب کے لئے ضروری قرار دی تھیں، اور جن کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔ ان میں سے اہم ترین شرائط یہ تھیں:۔

۱۔ قاضی کو اپنی تقرری سے پہلے کے مقدمات و واقعات کا علم ہو۔

۲۔ اسے حرص و لالچ سے نفرت ہو۔

۳۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا تقویٰ غالب ہو۔

صرف حنفی فقہاء ہی نہیں بلکہ اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب کے آئمہ بھی قاضیوں کے لئے انہی شرائط کو لازم قرار دیتے تھے۔ لیکن عباسی دور میں بعض فقہاء نے یہ فتویٰ دے دیا کہ فاسق لوگوں کو بھی قاضی کا عہدہ سونپا جا سکتا ہے۔ ان فقہاء کا تعین نہ ہو سکا۔ عام طور پر الزام یہ تھا کہ یہ فتویٰ حنفی فقہاء نے جاری کیا تھا۔ کیونکہ بعد میں حنفی فقہاء اس پر عمل کرنے لگے۔

ہدایہ میں ہے :-

وَالفاسِق اهلٌ لِلقضاء ـ حَتّٰی لَوْ قلّد يصحُ ـ [1]

(ترجمہ) ایک فاسق شخص قاضی بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اسے یہ عہدہ سونپ دیا جائے تو یہ صحیح ہوگا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اسی ہدایہ میں اگلے صفحہ پر وہ اصل فتویٰ بھی موجود ہے جس کے مطابق حنفی فقہ کے تینوں بانی آئمہ نے فاسق کو قاضی بنانا ناجائز قرار دیا تھا۔ ملاحظہ ہو :-

و قال الشافعیؒ الفاسق لا یجوز قضاتهٗ کما لا تقبل شهادتهٗ وعن علمائنا الثلاثة رحمهم الله فی النوادر انهٗ لا یجوز قضاءهٗ ـ [2]

(ترجمہ) اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فاسق شخص کو قاضی

---

[1] کتاب ادب القاضی شرح فتح القدیر جلد پنجم صفحہ ۴۵۴

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۴۵۵

بنانا جائز نہیں۔ جس طرح کہ اس کی گواہی قبول نہیں کی جا سکتی، اور ہمارے تینوں آئمہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام محمد اور امام ابو یوسف (رحمہم اللہ علیہم) سے کتب نوادر میں منقول ہے کہ فاسق کی قضاء جائز نہیں۔

اللہ اللہ کہاں وہ عہد تھا کہ قاضی کے عہدے کے لئے امت میں سے بہترین متقی اور علوم اسلامیہ کے ماہر کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے حکمرانوں کے عہدے سے بھی زیادہ ترجیح دی جاتی تھی۔ اور کہاں عباسی خلافت کا سنہری دَور کہ فاسق لوگوں کو قاضی بنانے کے فتوے دیئے جانے لگے۔ جمہور علمائے اسلام نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ کسی شخص کو نہ تو از خود عہدۂ قضاء کی درخواست کرنی چاہیئے اور نہ حاکم کے زور ڈالنے کی صورت میں اس منصب کو قبول کرنا چاہیئے۔ اسی لئے کثیر التعداد فقہاء اور صلحاء کے دلوں میں یہ خیال جم گیا تھا کہ قضاء کے عہدے پر متمکن ہونے کا مطلب تقویٰ و طہارت اور دین سے ہاتھ دھونا تھا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے اور ایسے لوگوں کو قاضی مقرر کیا جانے لگا جو اعلانیہ اسلامی احکامات کی خلاف ورزی کرتے تھے۔

اسلامی مساوات سے روگردانی

اس دور کہ جسے مسلمانوں کی تاریخ کا سنہری دَور کہا جاتا ہے۔ ایک غلط قدم، اسلامی مساوات سے روگردانی تھا۔ اسلامی مساوات دینِ اسلام کی اہم بنیاد تھی، اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، کفّارِ مکہ کے لئے قرآن مجید کی یہ دعوتِ مساوات حد درجہ تکلیف دہ تھی۔ اسلامی حکومت کے پچھلے تمام ادوار میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے علاوہ

اپنا کوئی امتیاز نہیں جتاتے تھے۔ ایک دفعہ جب چوری کی حد سے بچانے کے لئے ایک قریشی عورت کی سفارش کی گئی تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی، تو میں اس کے ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ صدر اول میں کس طرح خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفاء، قاضیوں کی عدالت میں حاضر ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے لیکن اس دور میں اسلامی حکمرانوں کو بعض ایسی مراعات دینے کے فتوے جاری ہوئے جو اسلام کے قانونِ مساوات کو ختم کر دینے کے مترادف تھے۔ ان مراعات کی رُو سے مسلمان حکمرانوں کو نہ صرف یہ کہ عدالتوں میں حاضر ہونے سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ بلکہ اگر وہ جرائم میں ماخوذ ہوتے تو انہیں شرعی حدود سے ماوراء قرار دے دیا گیا۔ اس بارے میں ایک اہم فتویٰ کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:-

وکلّ شئ صنعه الامام الذی لیس فوقه امامٌ فلا حدّ علیه الا القصاص فانّه یوخذ به والاموال۔ [۳]

(ترجمہ) ایسا مسلمان حکمران کہ جس کے اوپر کوئی دوسرا اعلیٰ حاکم نہیں (یعنی وہ خود مختار بادشاہ ہے) تو وہ جو بھی جرم کرے (مثلاً زناکاری، شراب خوری وغیرہ) تو اس پر کوئی شرعی حد نہیں، سوائے کسی انسان کے قتل کرنے کے اور اس کے مال کو ضائع کرنے

---

[۳] ہدایہ مع شرح فتح القدیر جلد چہارم صفحہ ۱۶۰ (باب الوطی الذی یوجب الحد)

اور اس فتویٰ میں یہ الا القصاص والے الفاظ بھی تکلف معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ ان مسلمان حکمرانوں نے اپنے سیاسی اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے کس طرح اپنے وفادار لوگوں کو قتل کرنے سے دریغ نہ کیا۔ مختصر یہ کہ اس دور میں اسلام کے نظامِ مساوات سے روگردانی کی ایسی طرح ڈالی گئی کہ اس کے بعد اس کی طرف واپسی ناممکن ہو گئی۔

حیلوں کے سہارے عدالتی کارروائی سے بچنا

جب سلاطین کے لئے مذکورہ بالا مراعات کی شکل خصوصی حقوق کی گنجائش نکال لی گئی۔ تو دوسرے با اثر امراء کو ان حقوق سے فائدہ اٹھانے میں کونسی چیز مانع ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس دور میں ایک بڑے فقیہہ نے ایک ایسی کتاب مدون کی کہ جس میں ایسے حیلے بہانوں کی تعلیم دی گئی تھی کہ احکامِ شریعت سے کیونکر نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ آج بھی عدالتوں میں قانونی موشگافیوں کے ذریعے دوسرے کے حقوق باطل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک شرعی حقوق کا تعلق ہے۔ آج بھی اس گئے گزرے دور میں انہیں باطل قرار دینے کے لئے کوئی شریف انسان حیلہ جوئی سے کام نہیں لیتا۔ لیکن عباسی دور میں اسلامی قانون کے کچھ ایسے ماہرین کا ذکر ملتا ہے کہ جنہوں نے طبقۂ امراء کو شرعی احکامات سے نجات دلانے کے لئے ایک کتاب تصنیف کر ڈالی۔ جس کا نام "کتاب الحیل" تھا۔ یعنی حیلے سکھانے والی کتاب۔ اہل حدیث علماء نے بڑی سختی کے ساتھ اس کتاب کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کے مصنف کو شیطان و ابلیس کے القاب سے نوازا۔ اور اس پر فاسق و فاجر کے فتوے لگائے گئے۔

تاہم اس کتاب کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اہل حدیث علماء نے بعض حنفی فقہاء پر اس کتاب کو مرتب کرنے کا الزام لگایا، لیکن وہ بھی تعین سے یہ نہ بتا سکے کہ وہ کونسے فقیہہ ہیں۔

اس کتاب کے بعض مسائل سے اس کے مصنف کی دینی کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو عالم دین مسلمانوں کے لئے فریضۂ زکوٰۃ سے بچنے میں آسانی پیدا کرتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ جب سال ختم ہونے کے قریب ہو، تو تھوڑی دیر کے لئے اپنا مال اپنے لڑکے یا اپنی بیوی کے نام پر کر دو اور جب نیا سال شروع ہو تو پھر اپنے نام کرا لو۔ اس طریقے سے کسی پر زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔ ایسے مسلمان فقہ کے ماہر کے بارے میں کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں جو مسائل بیان کئے گئے ہیں، یہ ان میں سے ایک معمولی سی مثال ہے ورنہ اس میں اسقاط شفعہ اور قسم کی پابندی سے بچنے کے لئے ایسے ایسے شرعی حیلے بیان کئے گئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ حیلے اس اسلام سے منسوب کئے گئے کہ جس کے احکامات نہایت واضح ہیں۔ مالی حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات میں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے جائز حقوق سے محروم نہ کیا جا سکے۔ مثلاً کچھ خود غرض لوگ اپنی بیویوں کو وراثت سے محروم کرنے کے لئے یا حالتِ مرض میں انہیں طلاق دے دیتے تھے۔ اگرچہ قانوناً وہ وراثت کی حقدار نہیں رہتی تھی، لیکن چونکہ خاوند کا مذکورہ بالا فیصلہ بدنیتی پر مبنی ہوتا تھا، اس لئے اسلام اس عورت کو اس کا وارث قرار دیتا ہے۔ ایسے واضح احکامات کی موجودگی میں حیلہ و فریب کی کہاں گنجائش ہے۔ دراصل یہ ایک فطرتی امر تھا کہ جب ان لوگوں میں تقویٰ کی کمی ہونے لگی، تو ان کے دلوں میں مال و دولت کی

حرص بڑھنے لگی، اور اس کے حصول کے لیئے انہوں نے حیلوں اور فریب کاریوں سے کام لینا شروع کیا۔ کتاب الحیل کے مصنف نے ان انسانی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ایک پوری کتاب تصنیف کر ڈالی۔ جس میں یہ سارے حیلے جمع کر دیئے۔ علامہ ابن قیمؒ جوزی نے اپنی مشہور کتاب اعلام الموقعین کی دوسری جلد میں ان سارے حیلوں پر بڑی تفصیل سے بحث کر کے ان کا ابطال کیا ہے۔ لیکن چونکہ ان کی تفصیلات میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیئے اس کی طرف یہ مختصر اشارہ کافی سمجھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

قاضیوں کے دروازوں پر دربان

جب تک اسلامی معاشرہ سادہ تھا، اور مسلمانوں پر تقویٰ کا غلبہ تھا، تو جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، ان میں تنازعات کم ہوتے تھے۔ اگر کوئی وقوع پذیر بھی ہوتے، تو فریقین کسی بھی عالم دین سے اس بارے شرعی حکم معلوم کر کے اس پر خاموشی سے عمل کر لیتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں قاضیوں کے پاس خال خال مقدمات پیش ہوتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دَور کے قاضی تھے۔ لیکن ان کے عہد کی پوری مدّت کے دوران ان کے سامنے کوئی ایک مقدمہ تک پیش نہ ہوا۔ لیکن اب جب تقویٰ کا خاتمہ ہو گیا اور لوگ دنیا کی آسائشوں کے پیچھے دوڑنے لگے، تو قاضیوں کے پاس مقدمات کی بھرمار ہو گئی ان کے لیئے عدالتی کام سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے لوگوں کو روکنے کے لیئے اپنے دروازوں پر دربان بٹھا دیئے تاکہ ایک ایک مقدمے کے لوگوں کو باری باری اندر آنے دیں۔ یہ فتویٰ فقہ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔

"اگر قاضی مسجد یا دار میں بیٹھا تو ایک دربان مقرر کرے
کہ خصوم کو اژدحام سے منع کرے اور بواب یعنی دربان کو حلال
نہیں ہے، کہ اس سے کچھ لے کر آنے کی اجازت دے دیوے
یہ تاتارخانیہ میں ہے۔" [۴]

تمدّن کی وسعت کا عدالتی نظام پر اثر

کہا جاتا ہے کہ تمدّن کی وسعت کی وجہ سے ایسی صورتِ حالات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تمدّن کی وسعت کی کچھ تفصیلات پیش کر دی جائیں۔ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے بغداد کا نیا شہر اس غرض سے آباد کیا تھا کہ وہ تمام بلادِ اسلامیہ کا پایہ تخت ہو۔ اُس نے اس شہر میں جو ندرت اور انجوبگی پیدا کی، اس نے اُسے اس زمانے کے تمام شہروں سے ممتاز و فائق کر دیا۔ جب اس کی تعمیر مکمل ہو چکی تو اس میں تمام شہروں کے علماء جمع ہو گئے اور اسی طرح مختلف مذاق کے تاجر، کاریگر اور ہر قسم کے لوگوں کا اجتماع ہو گیا، اور ابھی اس کا دورِ حکومت ختم بھی نہ ہوا تھا کہ بغداد اس وقت کی دنیا کا خوبصورت ترین شہر بن گیا۔ اس کی وسعت دجلہ کے کنارے تک پھیل گئی۔ اور آبادی کوئی بیس لاکھ کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ اس کے مغربی کنارے پر منصور کا شہر اور مشرقی کنارے پر المہدی کا شہر تھا۔ اس کی تعمیر میں عربی، ایرانی اور رومی تینوں قسم کی عقل نے شرکت کی تھی۔ اس لئے ہر عقل کے اندر ایجاد و اختراع کی جو قدرت پوشیدہ تھی، بغداد نے اس سے بہترین حصّہ پایا تھا

---

[۴] اردو ترجمہ فتاویٰ عالمگیری مطبوعہ لاہور۔ جلد پنجم صفحہ ۱۳۴

اسی طرح اسلامی حکومت کے دوسرے علاقوں میں بھی بڑے بڑے شہروں نے شہرت حاصل کی۔ مثلاً اسپین میں قرطبہ، افریقہ میں قیروان، مصر میں فسطاط، شام میں دمشق اور وسطِ ایشیا میں مَرو و نیشاپور عظیم الشان شہر نظر آتے ہیں۔ جہاں پر علوم اسلامیہ کے متعدد ماہرین جمع ہو چکے تھے۔ پھر تمدن کے ساتھ ساتھ تجارت، زراعت اور صنعت میں بھی وسعت لازمی تھی۔ یہاں تک کہ اس دَور میں یہ تمام چیزیں اپنے عروج تک پہنچ چکی تھیں اور اس ترقی پر بجا طور پر فخر کیا جاتا تھا۔

ان اسلامی شہروں میں علمی حرکت، خالص عرب علماء تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ان کی اکثریت ان غلاموں میں سے تھی، جو ایران، روم اور مصر سے کثیر تعداد میں اسلام میں داخل ہوئی تھی۔ ان میں اکثریت تو ایسے غلاموں کی تھی، کہ جو بچپن میں گرفتار ہوئے اور اپنے مسلمان آقاؤں کی آغوش میں تربیت پائی تھی، اس لئے جن علوم اسلامیہ کی بنیاد، کتاب و سنت پر تھی۔ وہ انہوں نے اپنے آقاؤں سے ورثے میں پائے تھے۔ اور ان کے اچھے ماہر ہوگئے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے عربی النسل بھائیوں کے مقابلے میں ان میں بھی بڑے بڑے فقیہہ اور محدث پیدا ہونے لگے تھے۔

اس کے برعکس ان مفتوحہ ممالک کے جو لوگ پختہ عمر میں اسلام میں داخل ہوئے ان کے ذہنوں میں ابھی پچھلے سماجی نظاموں کے اثرات گہری جڑیں رکھتے تھے جن کا اثر اسلامی تعلیمات پر پڑنا بھی ناگزیر تھا۔ اسلام کے قانونِ مساوات سے گریز اور حیلوں بہانوں سے قانون کی گرفت سے بچنا، بادشاہوں کو خدائی حقوق سے نوازنا، یہ سب عجمی تہذیب و تمدن کے اثرات کی وجہ سے تھا۔

وکیل اور پیشہ ور گواہ | پچھلے ادوار کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے، کہ

مقدمے کے سلسلے میں عدالت میں صرف فریقین ہی پیش ہوتے تھے، اور ایک فریق کے دعوے اور دوسرے فریق کے جواب دعوے کو سن کر مقدمے کا فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ اس دور میں فقہ کی جو کتابیں مرتب ہوئیں ان میں ایک باب کتاب الوکالۃ کا ہوتا تھا۔ لیکن وہ آج کل کے پیشہ وکالت سے مختلف چیز تھی۔ بلکہ اس وکالت کا تعلق عام طور پر چیزوں کی خرید و فروخت کے لئے کسی دوسرے شخص کو اپنی طرف سے مقرر کرنا ہوتا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کے اردو ترجمے میں وکالت کی تفصیلات اس کی جلد پنجم کے پورے ایک سو بیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن ان میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں کہ فریقین مقدمہ کے لئے بھی ان وکیلوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھی یا نہیں۔ وکیل جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ عام طور پر کسی آدمی کی طرف سے خرید و فروخت کے معاملات کے لئے مقرر کئے جاتے تھے۔ ان کے لئے اسلامی قانون کی تعلیم لازمی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ زیادہ تر ایسے جھگڑے چکاتے تھے جو خرید و فروخت کے نتیجے میں پیدا ہوتے تھے۔ تاہم جس مقصد کے لئے آج کل وکالت کا پیشہ رواج پا چکا ہے۔ عباسی دور میں اس مقصد کے لئے جن لوگوں کو اجازت دی جاتی تھی انہیں پیشہ ور گواہ کہا جاتا تھا۔ ان پیشہ ور گواہوں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے علامہ ابن خلدون اپنے شہرہ آفاق مقدمہ ابن خلدون میں لکھتے ہیں:۔

"شہادت ایک دینی فریضہ ہے، جو اسلامی ریاست کے عدالتی نظام کا ایک حصہ ہے اور قاضی ہی کی اجازت سے ایسے گواہ مقرر کئے جا سکتے ہیں جو قرض، ہبہ، وصیّت، وراثت اور ہر قسم کے معاہدوں اور ٹھیکوں کی دستاویز پر اپنی شہادت ثبت کریں۔ چونکہ ایسی شہادتوں کا تعلق انسانی حقوق سے ہے، اور جعلی گواہوں کی

صورت میں، ان کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ گواہ عدالت کے اوصاف سے مزیّن اور ہر قسم کے اتہامات سے بری ہوں۔ اس کے علاوہ جملہ قانونی دستاویزات کو تحریر کرنے اور انہیں سمجھنے پر قادر ہو۔ نیز فقہ کے ان مسائل سے باخبر ہو، جو لین دین، مضاربت، قرضوں، وصیّتوں اور اس قسم کے دوسرے معاملات سے متعلق ہیں۔ ان شرائط کا پورا کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے طویل مشق و مزاولت اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح چند مخصوص آدمیوں کو جو ان شرائط پر پورے اترتے تھے۔ دستاویزی گواہی دینے کے لئے متعین کر دیا جاتا تھا۔ ان آدمیوں کو مقرر کرنے سے پہلے قاضی ان کے چال چلن، اخلاق و عادات اور دیگر تمام کوائف سے واقفیت حاصل کر لیتا تھا۔ اور جب اسے یہ اطمینان ہو جاتا کہ مذکورہ شخص عدالت کی تمام شرائط پر پورا اترتا ہے۔ تب اسے پیشہ ور گواہ بننے کا سرٹیفیکیٹ دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ بازاروں میں دکانیں لگا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اہلِ معاملہ ان کے پاس آتے، اور دستاویزات وغیرہ لکھوا کر ان پر گواہیاں ثبت کراتے۔ ایسے لوگوں کو فقہی اصطلاح میں عدول کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ عدول کا لفظ ان لوگوں کے لئے بھی بولا جاتا تھا۔ جنہیں قاضی عام مقدمات میں پیش ہونے والے گواہوں کے چال چلن اور حالات کی جانچ پڑتال کے لئے مقرر کرتا تھا۔ ؁۵

؁۵ بحوالہ تاریخ القضاء فی الاسلام۔ از قاضی ابن عرنوس صفحہ ۱۳۱ مطبوعہ مصر

ابن خلدون کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ ور گواہ قاضی سے باقاعدہ اجازت نامہ لے کر اپنا کاروبار شروع کرتے تھے اور یہ کہ ان کے لئے فقہ اسلامی سے واقف ہونا ضروری تھا۔ اور قاضی اس واقفیت کا امتحان لے کر ہی اسے اجازت نامہ دیتا تھا، جبکہ فقہ کی کتابوں میں مذکور وکیل کے لئے نہ تو فقہ کی تعلیم لازمی تھی اور نہ ہی اسے اپنا کاروبار چلانے کے لئے کسی قاضی سے اجازت نامہ لینا پڑتا تھا۔ کوئی بھی آدمی وکیل بنایا جا سکتا تھا۔ جبکہ پیشہ ور گواہوں کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ پیشہ ور گواہ بھی اسی سنہری دَور کا تحفہ ہے۔ اس سے پہلے ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ امام جلال الدین السیوطی نے اپنی کتاب "حُسن المحاضرۃ" میں لکھا ہے کہ مصر کا سب سے پہلا قاضی جس نے اپنی عدالت میں پیش ہونے کے لئے باضابطہ گواہ مقرر کئے تھے، وہ عبدالرحمٰن بن مسروق تھا جسے ہارون الرشید نے سنہ ۱۷۷ھ میں اس عہدے پر فائز کیا تھا، اور سب سے پہلا شخص جس نے ان گواہوں کا رجسٹر مرتب کیا تھا، وہ مالک ابو نعیم اسحاق بن فرات تھا۔ جسے ہارون الرشید ہی نے سنہ ۱۸۰ھ میں مصر کا قاضی مقرر کیا تھا۔

پیشہ ور گواہوں کے کارنامے

کندی نے لکھا ہے کہ سب سے پہلا قاضی کہ جس نے گواہوں کی عدالت اور صداقت کی جانچ پڑتال کے لئے پیشہ ور گواہ مقرر کیا تھا وہ مفضل بن فضالہ تھا۔ جس نے سنہ ۱۷۴ھ میں مصر کی قضاء پر دوبارہ فائز ہونے کے بعد اپنے پیش کار فُلیحا نامی شخص کو اس عہدے پر مقرر کیا تھا۔ شروع شروع میں اس کے عہدے کا نام "صاحب المسائل" تھا۔ لیکن لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ وہ جھوٹے گواہوں سے رشوتیں لے کر ان کی عدالت و صداقت کی تصدیق قاضی

کے سامنے کر دیا کرتا تھا۔ اس خرابی سے نپٹنے کے لئے قاضی مفضل نے ایک کی بجائے دس پیشہ ور گواہ مقرر کر دیئے۔ اب لوگوں نے محسوس کیا کہ ان پر تو پہلے سے بھی بڑی مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر اسحاق بن معاذ نے ان اشعار کے ذریعے اس طریقے کی مذمت کی ؛-

سادعو الٰہی حتّی الصباح
لکیما یعیدك کلبًا ھزیلاً
سننت لنا الجور فی حُکمنا
وصیّرت قومًا لصوصًا عدولاً
ولم یسمع الناس فیما مضی
بان العدول عدید آقلیلاً

(ترجمہ) میں صبح تک نماز میں یہی دعا کرتا چلا جاؤں گا کہ خدا تجھے (یعنی مفضل بن نصالہ) کو ایک لاغر کتا بنا دے۔ تو نے مقدمات کے فیصلوں میں ظلم وجور پر کمر باندھ لی ہے، اور چوروں کی ایک جماعت کو عادل گواہ بنا دیا ہے۔ آج تک لوگوں نے یہ نہیں سُنا تھا کہ گواہی صرف چند لوگوں میں محدود ہوتی ہے۔ ؎٦

ان تفصیلات سے وہ محرکات بھی سامنے آجاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے پیشہ ور گواہوں کو رواج دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عامۃ الناس قاضیوں کے اس اقدام کے سخت مخالف تھے۔

فیصلے کے اصل اختیارات سلطان کے پاس تھے

چونکہ قاضی کا تقرر بادشاہِ وقت

؎٦ ایضاً صفحہ ۱۳۳

کرتا تھا، اس لئے تمام عدالتی اختیارات بھی اُسی کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ عام طور پر فوجداری مقدمات کا فیصلہ تو وہ بہت پہلے خود ہی کرتا تھا۔ اور صرف شہری مسائل جنہیں آجکل کی اصطلاح میں دیوانی مقدمات کہا جاتا ہے۔ قاضیوں کی عدالتوں میں فیصلہ ہوتے تھے۔ تاہم کبھی کبھار دیوانی مقدمات کا فیصلہ بھی بادشاہ خود ہی کر دیتا تھا، اور فیصلہ کرنے کے بعد اسے متعلقہ علاقے کے قاضی کے پاس برائے نفاذ بھیج دیا کرتا تھا جیسا کہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بادشاہ بڑے ظالم ہوتے تھے اور بڑی جرأت اور دلیری سے لوگوں پر ظلم کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صالحینِ امت نے ان بادشاہوں کے ماتحت قاضی کا پیشہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم کچھ فقہاء ایسے بھی تھے کہ انہوں نے ایسے عہدے قبول کرنے میں کوئی عار نہ سمجھا۔ بلکہ عامتہ الناس کے شکوک وشبہات دور کرانے کے لئے یہ فتویٰ دلوایا گیا کہ :۔

ثمّ یجوز التقلد من السلطان الجائر کما یجوز من العادل ۔ [۱]

(ترجمہ) قاضی کا عہدہ ظالم بادشاہ کی طرف سے بھی اسی طرح قبول کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ عادل بادشاہ کا پیش کردہ عہدہ ۔

اور ظاہر ہے کہ ان ظالم بادشاہوں سے یہ توقع بہت ہی کم کی جا سکتی تھی کہ وہ نیک اور متقی لوگوں کو عدالتی کام کے لئے منتخب کریں گے ۔ اگر کبھی کسی نیک سیرت شخص کو انہوں نے قاضی بنا دیا کہ صرف اس صورت میں کہ وہ ان ظالموں کو ان کے ظلم پر نہ ٹوکے ۔ بادشاہ کے خدائی حقوق کا فتویٰ جو پچھلے صفحات میں

---

[۱] ہدایہ مع شرح فتح القدیر جلد پنجم صفحہ ۴۶۱

نقل کیا جا چکا ہے۔ وہ ایسے ہی بادشاہوں کی یاد دلاتا ہے۔ پھر ایسے بادشاہوں کے فیصلوں کو قاضی کی جانب سے نافذ کرانے کے لئے یہ فتویٰ بھی جاری ہو گیا:۔

واذا رفع الی القاضی حکم حاکم امضاہ الا ان یخالف الکتاب والسنۃ او الاجماع ؎۸

(ترجمہ) اور جب بادشاہ کا کوئی فیصلہ قاضی کو نافذ کرانے کے لئے بھیجا گیا تو اگر وہ کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو، تو اسے نافذ کرے۔

اسلامی قانون کو مدون کرنے کی تجویز

اس تمام صورت حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے عدالتی نظام میں یک رنگی باقی نہ رہی، اور مختلف شہروں میں ایک قسم کے تنازعات کے بارے میں متضاد قسم کے عدالتی فیصلے دیئے جانے لگے۔ ان متضاد قسم کے عدالتی فیصلوں کا اثر صرف فریقین مقدمہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ حکومت کے نظام پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے، جس نے حکومت کے مشیروں کو چونکا دیا۔ چنانچہ بنو عباس کے دوسرے خلیفے ابوجعفر منصور کے ایک وزیر ابن المقفع نے متوقع اختلاف کے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ وہ اسلامی قانون کو مدوّن کرائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنی تجاویز ایک کتابچہ بعنوان "رسالۃ الصحابۃ الی امیر المومنین" کی صورت میں مرتب کر کے ابوجعفر منصور کی

؎۸ ایضاً صفحہ ۴۸۷

خدمت میں پیش کیا۔

ابن المقفع نے اپنی ان تجاویز میں اپنے عہد کے مختلف شہروں کے قاضیوں کے فیصلوں کے اختلافات کا حال بیان کیا اور بتایا کہ ایک ہی قسم کے قصاصات میں کوفہ کے قاضیوں کا فیصلہ کچھ ہے اور حیرہ کے قاضیوں کا کچھ اور۔ جس کے نتیجے میں مملکت میں اضطراب اور بے چینی پھیلنے لگ گئی ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ سنت پر عمل کرنے کے مدعی ہیں، وہ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے فلاں فیصلہ سنت کی رُو سے کیا ہے۔ لیکن دراصل وہ ان کے ذاتی فیصلے ہوتے ہیں اور جب ان سے ان کے فیصلے کی دلیل بیان کرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ بالکل خاموش ہو جاتے ہیں اور اپنی تائید میں احادیثِ نبوی ؐ اور تعاملِ صحابہ ؓ پیش کرنے کی بجائے عبدالملک بن مروان اور اس قسم کے دوسرے حکمرانوں کے اقوال و افعال پیش کرنے لگ جاتے ہیں۔ اہل الرائے یعنی فقہاء کا بھی یہی حال ہے۔ وہ فیصلے تو اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کے مطابق کرتے ہیں۔ لیکن ان فیصلوں کی تائید میں ایسے دلائل دیتے ہیں جنہیں کوئی ہوشمند مسلمان قبول نہیں کر سکتا۔ ان حالات و واقعات کی موجودگی میں امیرالمؤمنین کو جس مسئلے پر خاص طور پر غور کرنا ہے وہ یہ فقہی اختلافات کا مسئلہ ہے، جو اب اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس مسئلہ کا حل اگر امیرالمؤمنین پسند فرمائیں تو یہ ہو سکتا ہے، کہ آپ ایک حکم جاری فرمائیں کہ قاضیوں کے تمام فیصلے ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے خدمتِ والا میں پیش کیے جائیں۔ اور ساتھ ہی ہر گروہ اپنے اپنے عقلی اور نقلی دلائل بھی جو وہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اپنے پاس رکھتا ہے، پیش کر دے۔

پھر امیر المؤمنین اس پورے ذخیرے پر نظر ڈال کر ہر معاملے میں اپنی رائے ظاہر کر دیں، اور مختلف شہروں کی عدالتوں کو اس کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے کی ممانعت کر دیں۔ اس طرح وہ تمام منتشر فیصلے جو رطب و یابس، ہر قسم کی چیزوں پر مشتمل ہیں۔ ایک مدون ضابطہ کی شکل اختیار کر لیں گے اور غلط چیزوں سے یہ مجموعہ پاک ہو گا۔ اس طرح توقع ہے کہ تمام بلادِ اسلامیہ ایک ہی ضابطہ، قانون کے تحت آجائیں گے، اور اللہ تعالیٰ امیر المؤمنین کی رائے اور فیصلے پر تمام امتِ مسلمہ کو متفق کر دے گا۔ [۹]

کہا جاتا ہے کہ ابو جعفر منصور نے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے کچھ کوششیں کیں۔ لیکن اس مقصد کے لئے وہ علمائے امت کا تعاون حاصل نہ کر سکا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی خواہشات کے مطابق مؤطا امام مالک نامی کتاب مرتب کی تھی کہ اس میں احادیث کے ساتھ ساتھ امام صاحب نے اپنے فتوی کا بھی ذکر کر دیا تھا۔ تاہم انہوں نے ابو جعفر منصور کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اسے نافذ کرنے کے لئے جبر سے کام نہ لے۔ کیونکہ دوسرے اسلامی شہروں میں ایسے بہت سے صحابہ رسول ﷺ پھیل چکے ہیں کہ جن کے بعض ایسے اقوال مل جائیں گے جو مؤطا میں درج نہیں ہو سکے۔ اس لئے اس سے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس نصیحت کو سننے کے بعد ابو جعفر منصور نے اپنے ارادے کو ترک کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی عدالتی نظام رو بہ انحطاط تھا، اور کسی قسم کی نگرانی نہ

---

[۹] تاریخ القضاء فی الاسلام از ابن عرنوس صفحہ ۸۵

ہونے کے باعث بیشتر قاضی جادۂ حق و انصاف سے روگردانی کرنے لگے۔ یہانتک کہ انہوں نے لوگوں پر ظلم کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ردِ عمل کے طور پر عامۃ الناس کے دلوں سے قاضیوں کا اعتماد زائل ہونے لگا۔ اور ان کے ہر فیصلے کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ اس پر مجبوراً حکام کو انہیں ہدایت کرنی پڑی کہ وہ فیصلے کرتے وقت صرف ایک مذہب کی فقہ کو سامنے رکھیں، تاکہ عوام کے دلوں میں ان فیصلوں کے خلاف شکوک و شبہات پیدا نہ ہو سکیں۔

اسلامی قانون کی تدوین کا آغاز

اسلامی قانون کے ماہرین کی ایک جماعت کا وجود تو ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا، اور ان میں سے جتنا کوئی بڑا عالمِ دین ہوتا وہ وقت کے حکمرانوں سے دور دور رہنے کی کوشش کرتا۔ جن لوگوں میں تقویٰ ابھی تک باقی تھا وہ انہی ماہرینِ اسلام سے شرعی حکم معلوم کر کے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے۔ اب جب حکومت کے عدالتی نظام اور قاضیوں کے بارے میں لوگوں میں بدگمانیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں، تو عام لوگوں کا رجوع، ان کی طرف اور زیادہ ہو گیا۔ اب جبکہ حکومت کی طرف سے بھی یہ فرمان جاری ہو گیا، تو اسلامی قانون کے ان ماہرین نے فیصلہ کیا کہ اسلامی قانون کو مدون کر دیا جائے، تاکہ قاضی لوگ عوام پر ظلم نہ کر سکیں۔ ان عظیم ہستیوں نے اسلامی قانون کے اصول و ضوابط کی ترتیب اور استنباطِ احکام میں بڑی کد و کاوش سے کام لیا۔ اور عامۃ الناس کی راہنمائی کے لئے اسلامی قانون کے مجموعے تیار کئے۔ اس زمانے میں چونکہ آزادیٔ فکر تھی۔ اس لئے کوئی ستر فقہی مذاہب وجود میں آگئے۔ مرورِ زمانہ کی وجہ سے جن میں سے اکثر مردہ ہو چکے ہیں اور ان میں سے اب صرف آٹھ دس فقہی مذاہب باقی رہ گئے ہیں، اور ان میں سے پانچ

مذاہب زیادہ مشہور ہیں ۔چار سنیوں کے اور ایک شیعہ کا۔ اور آج دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت انہی پانچ فقہی مذاہب میں سے کسی نہ کسی کی پیروکار ہے ۔ان مذاہب کے بانیوں کے نام یہ ہیں :۔

(۱) حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت جنہوں نے حنفی مذہب کی بنیاد ڈالی۔ آپ کے پیروکار حنفی کہلائے ۔

(۲) حضرت امام مالک بن انس جنہوں نے مالکی مذہب کی بنیاد ڈالی۔ آپ کے پیروکار مالکی کہلائے ۔

(۳) حضرت امام جعفر صادق جنہوں نے جعفریہ فقہ کی بنیاد ڈالی ۔ اہلِ تشیع یعنی شیعہ حضرات اس فقہ پر عمل کرتے ہیں ۔

(۴) حضرت امام محمد بن ادریس الشافعی جنہوں نے شافعی مذہب کی بنیاد ڈالی۔ آپ کے پیروکاروں کو شوافع کہتے ہیں ۔

(۵) حضرت امام احمد بن حنبل کا مذہب حنبلی کہلاتا ہے ۔اور آپ کے پیروکار حنابلہ کہلاتے ہیں ۔

فنا ہونے والے مذاہب میں سے جو چند دوسرے فقہی مذاہب بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے باوجود زندہ رہے ۔ وہ زیدیہ، ظاہریہ اور آباضیہ ہیں ۔ صدر ناصر نے اپنے دَورِ حکومت میں اسلامی فقہ کا جو انسائیکلو پیڈیا تیار کروایا۔اس میں مذکورہ بالا آٹھوں فقہی مذاہب کے اقوال دیئے گئے ہیں ۔اسلامی قانون کو مدون کرنے والے ان بزرگانِ دین کے حالات محمد الخضری کی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی سے اختصار سے نقل کیے جاتے ہیں ۔

امام ابوحنیفہؒ اور اسلامی قانون کی تدوین

آپ کا اسم مبارک نعمان بن ثابت زوطی تھا۔آپ ۸۰ھ

ہیں کوفہ کے مقام پر پیدا ہوئے اور جب عنفوانِ شباب کو پہنچے تو دوسری صدی ہجری کے ابتداء میں حماد بن ابی سلیمان سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، اور بہت سے دوسرے تابعین مثلاً عطاء بن ابی رباح اور نافع مولی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت سنی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے وہ زمانہ پایا کہ جس میں خلافت بنوامیہ سے منتقل ہوکر بنوعباس میں آئی۔ اور اس انتقال کے زمانے میں کوفہ عظیم الشان علمی حرکت کا مرکز تھا۔ اور وہیں ابوالعباس سفاح کی بیعت کی تکمیل ہوئی۔ لیکن اس حرکت کے زمانے میں، ان کا کوئی خاص ذکر نہیں آتا۔ البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ یزید بن ہبیرہ نے جو مروان بن محمد کی جانب سے عراق کا والی تھا، نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ لیکن آپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، تو اس نے آپ کو سزا دی تھی۔ یہ واقعہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ قاضی کا عہدہ مملکت میں بڑی عزت کا عہدہ سمجھا جاتا تھا اور یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کو اتنی بڑی عزت کا عہدہ پیش کرنے کے بعد اسے کوڑوں کی ذلت آمیز سزا دی جائے۔ ویسے بھی اس وقت کوفہ میں بکثرت فقہاء موجود تھے اور ابن ہبیرہ آسانی سے ان میں سے کسی کو قاضی کے منصب کے لئے منتخب کرسکتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم منصب کے پیش کرنے سے ان کا مقصد امام صاحب کا امتحان لینا تھا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ وہ حکومت کے ساتھ کس قدر محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت کے علماء جس حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ اس کا کوئی منصب بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس سے اس غلط حکومت کی تائید ہوتی تھی۔

اس زمانے میں کوفہ میں دو انقلاب انگیز شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ ایک

زید بن علی بن الحسینؒ تھے۔ جنہوں نے ۱۲۲ھ میں ہشام بن عبداللہ کے خلاف اور یوسف بن عمر الثقفی کی امارت میں، عراق میں بغاوت کی، اور مقتول ہوئے۔ دوسرے عبداللہ بن معاویہ بن جعفر، جنہوں نے ۱۲۷ھ میں جبکہ سلطنت کے کاروبار میں بدظنی پیدا ہو گئی تھی، بغاوت کی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جیسا کہ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے۔ زید بن علی کی تعریف کی تھی۔ اور ممکن ہے کہ عبداللہ بن معاویہ کے زمانے میں بھی انہوں نے اس قسم کے مدحیہ الفاظ کہے ہوں۔ اس لئے ابن ہبیرہ نے بنوامیہ خاندان کے ساتھ ان کی دوستی کا اندازہ لگانے کے لئے ان کے سامنے قاضی کا عہدہ پیش کیا اور اسے نہ قبول کرنے پر انہیں سزا دی۔ کیونکہ اسے محسوس ہو چکا تھا، کہ وہ بنوامیہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں ریشمی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے، اور کاروباری معاملات میں اپنی سچائی کے لئے مشہور تھے۔ آپ لین دین میں ٹال مٹول کرنے سے نفرت کرتے تھے۔ آپ شگفتہ رو، پاکیزہ صحبت اور اپنے بھائیوں کے ہمدرد تھے، آپ کا قد درمیانہ، گفتگو کا طریقہ عمدہ اور لہجہ شیریں تھا۔ جعفر بن ربیع کہتے ہیں کہ اس نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں پانچ سال تک قیام کیا، لیکن ان سے زیادہ خاموش آدمی نہ دیکھا۔ لیکن جب ان سے فقہ کے متعلق سوال کیا جاتا تھا، تو دریا کی طرح بہنے لگتے تھے۔ اور غلغلہ انگیز گفتگو کرتے تھے۔ وہ قیاس کے امام تھے۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ انہوں نے سفیان ثوری سے پوچھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ غیبت سے کیوں احتراز کرتے ہیں۔ ان کی زبان سے تو دشمن کی غیبت بھی نہیں سُنی گئی۔ بولے وہ عقل مند آدمی ہیں جو یہ نہیں چاہتے کہ اپنی نیکیوں پر ایسی چیز

غالب کردیں گے، جو ان کا خاتمہ کر دے۔

بہت سے شاگردوں نے آپ سے تعلیم حاصل کی۔ اور اسلامی قانون کے مسائل استنباط کرنے اور ان کا جواب تیار کرنے میں آپ کی مدد کی۔ آپ جس طریقے سے فقہی مسائل کا استنباط کرتے تھے۔ اسے خود اس طرح بیان کرتے تھے:۔

"جب مجھے مسئلہ کتاب اللہ سے مل جاتا ہے تو اسے لے لیتا ہوں، لیکن جس مسئلے کو کتاب اللہ میں نہیں پاتا اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور آپ کے اُن آثار کو لیتا ہوں، جو ثقات میں شائع و ذائع ہیں۔ لیکن جب مجھے کتاب و سنت میں وہ مسئلہ نہیں ملتا، تو آپؐ کے اصحابؓ کے قول لیتا ہوں، اور ان میں سے جسے چاہتا ہوں لیتا ہوں، اور جس کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کے علاوہ اور کسی کے قول کو نہیں لیتا، اور جب ابراہیم، شعبی، حسن، ابن سیرین، سعید بن المسیّب اور ان جیسے دوسرے مجتہدین تک معاملہ پہنچتا ہے تو مجھے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ جس طرح ان لوگوں نے اجتہاد کیا، اسی طرح میں بھی کروں۔"

سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے کلام کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ثقہ اقوال کو لیتے تھے۔ برائی سے بھاگتے تھے اور لوگوں کے معاملات پر اس اصول کی روشنی میں کہ جس پر وہ استقامت کے ساتھ قائم تھے، نظر ڈالتے تھے۔

وہ تمام مسائل کے بارے میں قیاس سے کام لیتے تھے۔ لیکن جب قیاس

ٹھیک نہ ہو تو استحسان سے کام لیتے تھے۔ یعنی مسائل کا ایسا حل جو قیاس کے تو خلاف ہوتا، لیکن معاشرے کے حالات کے مطابق زیادہ خوبصورت ہوتا۔ اگر اس اصول سے مسئلہ حل ہو جاتا تو ٹھیک، وگرنہ مسلمانوں کے عملدرآمد کی طرف رجوع کرتے تھے۔ پہلے وہ معروف حدیث جو مجمع علیہ ہوتی کی سند رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے تھے، پھر جب تک قیاس ہو سکتا تھا، اس پر قیاس کرتے تھے اور پھر استحسان اور قیاس میں سے جو قابلِ عمل ہوتا اس پر عمل کرتے تھے۔

محمد بن حسن کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اپنے شاگردوں سے قیاسات میں مناظرہ کرتے تھے، اور یہ لوگ اس میں ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ لیکن جب وہ یہ کہہ دیتے تھے کہ استحسان کی رو سے اس مسئلہ کی صورت یوں ہے تو پھر کوئی ان کی گرد تک کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ استحسان میں بکثرت مسائل لاتے تھے۔ اس لئے وہ لوگ ان تمام مسائل کو چھوڑ کر ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ اہلِ کوفہ کی حدیث و فقہ کے ماہر تھے، اور ان کے اہلِ شہر کا جو مسلک تھا اس کی شدّت کے ساتھ تقلید کرتے تھے۔

ان کے زمانے میں کوفہ میں تین بڑے فقیہہ تھے۔ سفیان بن سعید الثوری، جو اہلحدیث کے امام تھے، دوسرے شریک بن عبداللہ النخعی اور تیسرے محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلی۔ ان تینوں فقہاء اور امام صاحب کے درمیان نوک جھوک رہتی تھی۔ سفیان الثوری سے تو اس لئے کہ فقہاء اور اہل حدیث علماء میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ ابن ابی لیلی سے اس لئے کہ وہ شہر کے قاضی تھے۔ اور جس چیز کے متعلق وہ فیصلہ کرتے تھے۔ بسا اوقات امام ابو حنیفہؒ سے اس کے بارے میں استفسار کیا جاتا تھا اور وہ عام طور پر ان کے فیصلے کے خلاف فتویٰ دیتے تھے۔

جس کا اثر ابن ابی لیلیٰ پر پڑتا لازمی تھا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے ایک بار امیرِ کوفہ کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو فتویٰ دینے سے روک دے۔ اور تیسرے یعنی شریک بن عبداللہ اور امام ابو حنیفہ رہ کے درمیان معاصرانہ چشمک تھی۔

جب ابو جعفر منصور نے شہر بغداد کی بنیاد ڈالی تو وہاں مختلف شہروں کے بہت سے اکابر علماء کو طلب کیا۔ جن میں سے ایک امام ابو حنیفہ رہ بھی تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں بھی ان کے سامنے قاضی کا عہدہ دوبارہ پیش کیا گیا۔ اور اس کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے انہیں سزا بھی دی گئی تھی۔ آپ نے بعض روایات کے مطابق اسیری میں اور بعض روایات کے مطابق اپنے گھر میں نظر بندی کی صورت میں ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

کہا جاتا ہے کہ امام صاحب نے اسلامی قانون کی تدوین کے لئے ایک مجلس بنائی تھی۔ جس نے آپ کی صدارت میں کوئی تین لاکھ اسلامی قانون کی دفعات مرتب کیں۔ لیکن عجب اتفاق ہے کہ آج دنیا میں اس مجموعے کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ بلکہ آپ کی کوئی بھی تصنیف باقی نہ بچی، اور جو فقہ آپ کی طرف منسوب ہے وہ آپ کے ایک شاگرد امام محمدؒ کے شاگردوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ آپ کے شاگردوں میں سے بھی امام ابو یوسف کی ایک کتاب یعنی "کتاب الخراج" ہم تک پہنچ سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود حنفی فقہ کی کتابوں میں امام ابو حنیفہ رہ کی اہم فتاویٰ نہیں ملتے جبکہ یہی فتوے دوسرے مذاہب کی کتابوں میں موجود ہیں جیسا کہ وقف کے ناجائز ہونے کے بارے میں ان کا فتویٰ۔ تاہم آپ کے شاگردوں خصوصاً امام ابو یوسف کے قاضی بن جانے کی وجہ سے آپ کی طرف منسوب فقہ نے دوسرے مذاہب کی نسبت زیادہ عروج حاصل کیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو کتاب "الموطا" تصنیف فرمائی تھی وہ تو آئندہ نسلوں تک حرف بہ حرف پہنچ گئی ہے بلکہ ایک نسخہ تو حضرت امام ہی کے مشہور شاگرد امام محمدؒ کے ذریعے ہی پہنچا ہے۔ لیکن انھوں نے خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تیار کردہ فقہی مجموعہ آئندہ نسلوں تک پہنچانے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ حالانکہ وہ امام صاحب کے آزاد کردہ غلام تھے۔

حضرت امام مالک بن انس

اہلِ سنت کے جو چار فقہی مذاہب معروف ہیں، ان میں سے دوسرے فقہی مذہب کے بانی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا ابوعامر رضی اللہ عنہ صحابیٔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے اور بدر کے سوا تمام غزوات میں آپؐ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ آپ نے مدینہ منورہ ہی میں، مختلف اہلِ علم سے تعلیم حاصل کی۔ اور جب مدینہ کے ستّر شیوخ یعنی علمائے دین نے آپ کو فتویٰ دینے کے اہل قرار دے دیا تو آپ اس مسند پر بیٹھ گئے۔

تمام اہلِ علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آپ علمِ حدیث کے امام تھے اور آپ کی روایت قابلِ اعتماد ہے۔ بعض اہلِ علم کا یہ خیال ہے کہ صحیح ترین حدیث ہی وہی ہے جو امام مالکؒ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بواسطہ نافع روایت کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ سلسلۂ روایت جو امام مالکؒ سے شروع ہو کر بہ ترتیب زُہری اور سالم کے واسطے سے حضرت ابنِ عمرؓ تک پہنچتا ہے۔ تیسرا وہ سلسلہ ہے جس کی روایت امام مالکؒ بہ ترتیب ابوالزناد اور اعرج کے ذریعے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں۔

مورخ واحدی لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کی مجلس علم نہایت باوقار تھی وہ بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے اور ان کی مجلس میں کسی قسم کا مجادلہ یا شور و شغب نہیں ہوتا تھا۔ جب ان سے سوال کیا جاتا تھا اور وہ سائل کو جو بھی جواب دیتے تھے تو وہ آپ سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ آپ نے اس کا جواب کس ماخذ سے دیا ہے۔ حبیب نامی ایک شخص آپ کا کاتب تھا۔ جس نے آپ کی کتابیں تحریر کیں۔ وہ طلباء کی جماعت کے سامنے ان کتابوں کو پڑھتا تھا۔ لیکن حاضرین میں سے نہ کوئی شخص ان کے قریب جا سکتا تھا اور نہ ان کتابوں کو دیکھ سکتا تھا، اور نہ ہی ان کے بارے سوال پوچھ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ ان کی پُرشکوہ شخصیّت کا اثر تھا۔ تاہم حبیب کاتب جب غلطی کرتا تھا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کی تصیح کر دیتے تھے۔ ان کے مشہور شاگرد یحییٰ بن بکیر کا بیان ہے کہ انہوں نے امام مالکؒ سے مؤطا چودہ بار سُنی اور زیادہ تر امام مالکؒ نے اسے خود پڑھ کر سنایا اور بعض مرتبہ انہوں نے بھی پڑھا۔

امام مالکؒ سے بہت سے اکابرینِ حدیث نے حدیث کی تعلیم پائی۔ اور بہت سے فقہاء نے آپ کی تقلید کی۔ کیونکہ آپ میں بیک وقت دو خصوصیات جمع تھیں یعنی آپ محدّث بھی تھے اور فقیہہ بھی۔ آپ نے اپنے فتاویٰ میں اوّلاً قرآن مجید پر اور پھر ان احادیثِ نبویؐ پر اعتماد کیا۔ جو ان کے معیار کے مطابق صحیح تھیں۔ اس معاملے میں ان کا دار و مدار علمائے حجاز میں سے کبار محدثین پر تھا۔ جس چیز پر اہلِ مدینہ عامل تھے۔ اسے آپ سب سے زیادہ اہمیّت دیتے تھے۔ بلکہ اکثر احادیث کو صرف اس لئے رد کر دیتے تھے کہ اہلِ مدینہ نے اس پر عمل نہ کیا تھا۔ تاہم جب قرآن مجید یا حدیث سے

کوئی نص نہ ملتی تھی تو آپ قیاس پر بھی اعتماد کرتے تھے جس طرح حنفیہ کی طرف استحسان کی نسبت کی گئی ہے، اسی طرح امام مالکؒ کی طرف مصالح المرسلہ کی نسبت کی گئی ہے۔ مصالح المرسلہ ان مصلحتوں کو کہتے ہیں کہ جن کے جھوٹا یا سچا ہونے کی شہادت، کسی نص معین نے نہیں دی، اور ان پر عمل کرنے میں اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی نص یا قیاس کے مخالف ہو۔ مثلاً چوری کے اقرار کے لیے کسی شخص کو پیٹنا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے۔ لیکن دوسرے فقہاء اس مسئلہ میں ان کے مخالف ہیں۔ کیونکہ دوسری مصلحت، اس مصلحت سے ٹکراتی ہے، اور وہ اس شخص کی مصلحت ہے جسے پیٹا گیا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات وہ مجرم نہیں ہوتا اور مجرم کو سزا نہ دینا ایک بری الذمہ شخص کے سزا دینے سے بہتر ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس طریقے سے مال کا برآمد کرنا دشوار ہو جائے گا تو اس طریقے سے ایک بری الذمہ شخص کو سزا دینے کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس کی دوسری مثال اس عورت کا معاملہ ہے جس کا شوہر غائب ہو گیا اور اس کے مرنے اور جینے کی خبر معلوم نہیں ہوتی۔ اور اس نے چند سال انتظار بھی کر لیا اور شوہر کے تغیب ہو جانے کی وجہ سے نقصان بھی اٹھایا۔ نیز وہ عورت بھی جس کو برسوں سے حیض نہیں آتا۔ اور اس کی عدت رک گئی اور وہ نکاح نہ کر سکی۔ ان دونوں کے متعلق امام مالکؒ نے عمر کا لحاظ کیا ہے۔ اور ان کا قول یہ ہے کہ پہلی عورت، خبر کے نہ آنے کے چار سال بعد نکاح کر سکتی ہے۔ اور دوسری عورت کو مدت حمل یعنی نو ماہ کے گزر جانے پر تین مہینے تک عدت میں بیٹھنا چاہیئے۔ اس لئے اس کا مجموعہ ایک سال ہو گا۔ پہلی صورت میں بیوی کی مصلحت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور غائب شدہ شوہر کی مصلحت کو نظر انداز کر دیا گیا۔

دوسری صورت میں بھی بیوہ یا مطلقہ عورت کی مصلحت کا لحاظ رکھا ہے، حالانکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ فتویٰ اس قرآنی حکم کے خلاف ہے کہ مطلقہ عورتیں تین حیض تک انتظار کریں۔ اور مذکورہ بالا صورت میں عورت سن یاس کو نہیں کہ مہینوں کے حساب سے عدت گزارے۔ خلاصہ یہ کہ مصلحتِ مرسلہ اس مصلحت کو کہتے ہیں، جس سے کسی ایسے مقصدِ شرعی کی حفاظت کی جائے، جس کا مقصدِ شرعی ہونا کتاب اللہ یا حدیثِ رسول ؐ یا اجماع سے معلوم ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ساری عمر مدینہ منورہ میں ہی اپنا قیام رکھا، اور وہاں سے کسی دوسرے شہر تشریف نہ لے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر احادیث اہلِ حجاز کی روایت کردہ ہیں، اور ان کے مجموعۂ حدیث "مؤطا" میں حجازیوں کے سوا دوسرے اہلِ علم کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ لوگ سفر کرکے ان کے پاس آتے اور ان سے حدیث اور مسائل سیکھتے، یہاں تک کہ انہوں نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ زیادہ تر ان کے پاس اہلِ مصر، اہلِ مغرب یعنی مراکش، الجزائر وغیرہ اور اہلِ سپین کے علماء سفر کرکے آئے اور انہی لوگوں نے اپنے اپنے ممالک میں آپ کے مذہب کی اشاعت کی۔ آپ کی سدا بہار کتاب "مؤطا امام مالک" ہے، جو حدیث اور فقہ میں سب سے پہلی مدوّن کتاب ہے۔ آج بھی اگر امّتِ مسلمہ کو اس کتاب پر جمع کیا جا سکے تو دورِ اوّل کی طرح اس گئے گزرے دور میں بھی امّتِ مسلمہ سادگی اور اتحاد کی نعمت حاصل کر سکتی ہے۔

امام محمدؐ بن ادریس شافعیؒ

سنی فقہی مذاہب میں تیسرے مذہب کے بانی امام شافعیؒ ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نویں پشت میں جا کر ملتا ہے۔ آپ عسقلان کے صوبے میں بمقام غزہ ٹھیک اسی دن پیدا ہوئے کہ جس دن امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے وفات پائی یعنی ۱۵۰ھ میں۔ پیدائش کے دو سال بعد آپ کی والدہ آپ کو اپنے آبائی وطن مکہ مکرمہ واپس لے آئی، اور وہیں بحالت یتیمی، اپنی والدہ کی نگرانی میں نشوونما پائی، اور بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا۔ پھر فصیح عربی سیکھنے کے لئے قبیلہ ہذیل میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر شیخ الحرم ومفتیٔ مکہ، مسلم بن خالد الزنجی کی شاگردی اختیار کی۔ یہانتک کہ انہوں نے آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت دے دی۔ آپ مؤطا امام مالک پہلے ہی یاد کر چکے تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سنائی۔ تو انہوں نے آپ کی قرأت کو بہت پسند فرمایا۔

آپ نے اگرچہ اپنی فقہ کی تعلیم یمن، بغداد اور حجاز میں دی۔ جہاں آپ کے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن آپ کی اصلی قابلیت مصر میں آکر کھلی۔ یہاں آپ نے اپنے مصری شاگردوں کو اپنی کتابیں جدید طرز پر لکھوائیں، جو آپ کا مصری یا جدید مذہب کہلاتا ہے۔ آپ آخری عمر تک مصر ہی میں مقیم رہے، اور وہیں ۲۰۴ھ میں وفات پائی، اور مقبرہ ابن عبد الحکم میں مدفون ہوئے۔ اور موت وحیات دونوں حالتوں میں مصری علماء آپ کو بزرگ سمجھتے رہے۔ یہانتک کہ وہ حجازی سے زیادہ مصری

مشہور ہوئے۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ پہلے امام ہیں جنہوں نے لگاتار سفر کر کے خود اپنے مذہب کی اشاعت کی، اور اپنے تلامذہ کو اپنی کتابیں خود لکھوائیں۔ آئمہِ فقہ کو یہ خصوصیت حاصل نہ تھی۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے فقہی مذہب کی بنیاد آپ کے رسالۂ اصولیہ میں مدون کی گئی ہے۔ آپ ظواہر قرآن سے استدلال کرتے ہیں یہاں تک کہ کسی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ ظاہرِ قرآن مراد نہیں، اس کے بعد حدیث کو لیتے ہیں، اور خبرِ واحد پر جبکہ اس کا راوی ثقہ ہو، اس پر عمل کرتے ہیں۔ آپ صحیح حدیث کو وہی مقام دیتے ہیں، جو ان کے نزدیک قرآن مجید کو حاصل ہے۔ اور دونوں کو واجب الاتباع سمجھتے ہیں، حدیث کے بعد وہ اجماع پر عمل کرتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک اجماع کے معنی یہ ہیں کہ کسی مسئلہ کے خلاف کسی رائے کا علم نہ ہو۔ آپ قیاس کو بھی قابلِ عمل سمجھتے تھے، لیکن اس شرط پر کہ شریعتِ اسلامی میں اس کو اصل معین ہو۔ حنفی جس چیز کو استحسان اور مالکی مصالح مرسلہ کہتے ہیں، امام شافعیؒ نے اس اصول کی شدت سے تردید کی ہے۔ البتہ وہ استدلال پر عمل کرتے ہیں جو ان اصطلاحات کے قریب المفہوم ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ

اہلِ سنت کے چوتھے امام حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور فقہ کی تعلیم امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ سے حاصل کرنی شروع کی۔ تاہم آپ زیادہ وقت احادیثِ نبویؐ کے مطالعے میں مشغول رہتے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ جب بغداد سے نکلے تو وہاں احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ افضل، زیادہ عالم اور زیادہ فقیہہ کوئی شخص نہ تھا۔ آپ اپنے زمانے میں اہل حدیث کے مشہور امام ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ امام بخاری اور امام مسلم رحمتہ اللہ علیہما اور ان کے طبقے کے دوسرے محدثین نے آپ سے حدیث کی روایت کی۔

امام شافعیؒ جب بغداد تشریف لائے تو امام احمد بن حنبلؒ نے اُن سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ آپ کے بغدادی شاگردوں میں سب سے عالم تھے۔ جنہوں نے بعد میں خود اجتہاد کیا۔ آپ ان اہلِ حدیث مجتہدین میں سے تھے، جو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی طرح صحیح السند ہونے کی حالت میں خبرِ واحد پر عمل کرتے تھے اور اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو قیاس پر مقدم کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کا شمار فقہاء سے زیادہ اہل حدیث میں ہوتا ہے۔ آپ نے احادیث کا ایک مشہور مجموعہ مسند احمد بن حنبلؒ تالیف فرمائی جو چالیس ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ یہ مسند آپ کے بیٹے عبداللہ نے آپ سے روایت کی ہے۔ اصولِ فقہ میں آپ کی کتاب طاعۃ الرّسول، کتاب الناسخ و المنسوخ اور کتاب العلل ہے۔

مسئلہ خلقِ قرآن کی آزمائش میں امام احمد بن حنبلؒ نے ایسی ثابت قدمی دکھائی کہ وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گی۔ خلیفہ مامون نے مسئلہ خلقِ قرآن کی طرف جو دعوت دی تھی اسے بہت سے اہلِ حدیث علماء نے قبول کر لیا تھا۔ لیکن ۲۱۸ھ کے سال سے لے کر جس میں خلیفہ مامون نے اس مسئلے کی طرف دعوت دی اور ۲۳۳ھ تک کہ جب خلیفہ المتوکل نے اس مسئلہ کو ترک کر کے لوگوں کو عقائد و رائے میں آزادی کی ضمانت دی۔ امام احمد بن حنبلؒ پوری طرح ثابت قدم رہے۔ اور ان کی رائے کی صحت یا عدمِ صحت سے قطع نظر، ان کے اس استقلال نے انہیں امام العلماء کا شرف اور درجہ عطا کر دیا۔ کیونکہ معتقدات کی حفاظت کے لئے تکلیف برداشت کرنا انسان کے لئے شرف کا بہترین زیور ہے۔ امام صاحبؒ نے ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔

ان چاروں آئمہ کے علاوہ اہلِ سُنت کے اور بھی بہت سے مجتہد تھے، جن کی آراء اور فتاویٰ کو قبولِ عام حاصل ہوا، جیسے کہ امام اوزاعیؒ، امام داؤد الظاہریؒ، امام طبریؒ، اور امام ابن شبرمہؒ وغیرہم۔ ان آئمہ نے بھی اپنی اپنی علیحدہ فقہ مرتب کی تھی، لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ وہ مردہ ہو گئیں۔ تاہم ان حضرات کے بعض مشہور اقوال دوسرے فقہی مذاہب کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

آئمہ شیعہ

امامیہ جعفریہ اور زیدیہ

اہلِ سنت کے فقہی مذاہب کے علاوہ اس دَور میں شیعہ مسلمانوں کے دو مذاہب نے بھی کافی شہرت حاصل کی تھی۔ ایک شیعہ زیدیہ تھا، اور دوسرا شیعہ امامیہ۔ زیدیہ، حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں، جنہوں نے کوفہ میں ہشام بن عبدالملک کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس گروہ کے بہت سے لوگوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے بنو امیہ اور بنو عباس کے مقابلے میں عَلمِ بغاوت بلند کیا اور بلادِ طبرستان اور بلادِ یمن میں بعض کامیابیاں بھی حاصل کی تھیں۔

اس گروہ کے فقہی مذہب کے اصولوں کی رُو سے ان کے آئمہ میں اجتہاد کی شرط ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بکثرت آئمہ پیدا ہوئے، جو فقہ میں اصحاب الرائے تھے۔ اس دور میں ان کے امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ تھے۔ جنہوں نے مذہبِ زیدیہ کے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن کی ترتیب کتب فقہ کے مطابق دی گئی تھی۔ مثلاً کتاب الطہارت اور کتاب الاذان۔ انہی آئمہ میں سے امام حسن بن زید تھے، جو بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے بلادِ طبرستان پر حملہ کیا اور سنہ ۲۵۰ھ میں اُس پر قابض ہو گئے۔ وہ اس علاقے پر مرتے دم تک قابض رہے۔ یہاں تک کہ سنہ ۲۷۰ھ میں وہیں وفات پائی۔ انہوں نے فقہ میں کتاب الجامع اور کتاب البیان وغیرہ تصنیف کی۔ ان آئمہ میں سے

ایک امام قاسم بن ابراہیم العلوی بلادِ یمن میں قیام پذیر تھے۔ زیدیہ قاسمیہ اُن ہی کی طرف منسوب ہیں۔ اور کتاب الاشربۃ اور کتاب الایمان و النذور اُن کی تصنیفات ہیں۔

انہی آئمہ میں سے امام ہادی یحییٰ بن حسن ہیں۔ اور زیدیہ ہادویہ ان ہی کی طرف منسوب ہیں اور فقہ میں ان کی ایک جامع کتاب ہے۔ اس دور کے بہت سے علماء و محدثین، امامت کے متعلق مذہب زیدیہ رکھتے تھے اور بلادِ یمن کا بڑا حصہ، زیدیہ شیعہ ہے، اور شیعوں کے فقہی مذاہب میں سے زیدیہ کا فقہی مذہب جمہور مسلمانوں کے دوسرے فقہی مذاہب سے بہت زیادہ قریب ہے کیونکہ زیدیہ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شیخین سے زیادہ امامت کا مستحق سمجھتے تھے، لیکن وہ شیخین کے رتبے میں بھی کسی طرح کی کمی نہیں کرتے تھے۔

شیعہ امامیہ یا جعفریہ

اس دَور میں شیعہ امامیہ اثنا عشریہ یا جعفریہ کے سب سے بڑے امام ابوعبداللہ جعفر الصّادق تھے۔ جو ساداتِ اہلبیت سے تھے۔ اور اپنی حق گوئی کی وجہ سے صادق کا لقب پایا۔ آپ سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے، اور امام مالکؒ بن انس، امام ابوحنیفہؒ اور بہت سے علمائے مدینہ نے ان سے روایت کی۔ البتہ امام بخاریؒ نے آپ سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ شیعہ امامیہ کی فقہ کا دار و مدار آپ پر اور آپ کے والد ابوجعفر محمد باقر پر تھا۔ اس دَور میں ان کے سب سے بڑے مؤلف ابوالنفر محمدؒ بن مسعود العباسی اور ابوعلی محمدؒ بن احمد بن جنید ہیں۔ اور جناب ذرارہ بن اعین کو بھی جو فقہ، حدیث، علم کلام میں شیعوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے شیعوں میں بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔ آپ ابوجعفر باقر کے

شاگرد تھے۔

اس فقہی مذہب کی بنیاد یہ ہے کہ آئمہ معصوم ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔ آپؐ نے انہیں شریعتِ اسلامی کے ظاہر و باطن کی تعلیم دی، یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک آئمہ معصومین کے اقوال، خود شارع علیہ السلام کی نصوص کے مطابق ہیں۔ اس لئے شرعی احکامات اجتہاد اور رائے سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صرف امام معصوم ہی کے ذریعے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اجماعِ عام اور قیاس کو یہ لوگ شرعی اصول نہیں سمجھتے۔ اجماع کو تو اس لئے کہ جو شخص بھی آئمہ معصومین میں سے نہیں ہے۔ اس کے قول کا کوئی اثر نہیں۔ اور قیاس ایک رائے ہے اور شریعتِ اسلامی صرف رائے سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

یہ لوگ تقیہ کے بھی قائل ہیں۔ یعنی مخالفین کے شر سے بچنے کے لئے انسان اپنے عقیدے کے خلاف دوسرے عقیدے کا بھی اظہار کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے آئمہ سے روایتیں مختلف ہوتی ہیں، تو وہ اپنی کتابوں میں سے اس روایت کو جو جمہور کی رائے کے مطابق ہوتی ہے۔ تقیہ پر محمول کرتے ہیں۔

(بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی اردو ترجمہ التاریخ التشریع الاسلامی مصنفہ محمدؐ الخضری)

شرعی قوانین کی تدوین میں پیچیدگی کی طرف رجحان

سابقہ صفحات میں یہ تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں کہ عباسی دَور اصل میں اجتہاد کا دَور تھا۔ اور اس دَور میں مختلف رائے رکھنے والے فقہاء نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق اپنے فقہی مذاہب کی فقہ تدوین کی۔ اس دور سے قبل کے دَور میں بھی اگرچہ اجتہاد سے کام لیا گیا تھا، لیکن زندگی میں سادگی کی وجہ سے فقہی احکام بھی سادہ تھے۔ عام طور پر جو واقعات عملاً پیش آتے تھے۔ فقہی احکامات، ان کے متعلق رائے ظاہر کرنے تک محدود تھے۔ بعد کے ادوار کی طرح فقہاء فرضی مسائل کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے۔ لیکن عباسی دَور میں پہلے والی سادگی باقی نہ رہی تھی۔ نئے نئے مسائل پیدا ہوئے چنانچہ اس دَور کی عدالتی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے، فقہاء نے نہایت وسعت کے ساتھ، مسائل فرض کر کے ان کے جواب دیئے۔ اس سلسلے میں حنفی فقہ کو دوسرے تمام فقہی مذاہب پر تفوق حاصل ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ دوسرے فقہی مذاہب رائے اور قیاس سے بہت کم مدد لیتے تھے۔ اور امام مالکؒ کی فقہی تصنیف "مؤطا" اس طرزِ عمل کی سب سے عمدہ مثال ہے۔ اسی بنا پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "مؤطا امام مالک" کی بڑی تعریف کی۔ اور حق یہ ہے کہ اس اہم کتاب میں مختصر ہونے کے باوجود تمام مسائل موجود ہیں کہ جو کسی مسلمان کو پیش آسکتے ہیں۔ اس لئے عام طور پر یہ رائے دی جاتی ہے کہ اگر آج بھی شرعی مسائل کو قرآن حکیم اور مؤطا امام مالکؒ تک محدود کر لیا جائے، تو امتِ مسلمہ میں دورِ اوّل کی سادگی پیدا ہو

سکتی ہے۔

اس کے مقابلے میں حنفی مذہب سے تعلق رکھنے والے فقہاء نے اپنی قوّتِ تخیّل کے ذریعے لوگوں کے لئے ایسے ہزاروں مسائل فرض کئے کہ جن میں سے بعض کا تو سرے سے عملاً واقع ہونا ہی ناممکن تھا۔ اور بعض ایسے تھے کہ نسلیں گزر گئیں، لیکن کسی شخص نے ان کے وجود کو محسوس تک نہ کیا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ انھوں نے مندرجہ ذیل تین چیزوں کو سینکڑوں مسائل کی بنیاد قرار دیا۔ اور پھر ان کے جواب تیار کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا۔ یہ تین چیزیں یہ تھیں :-

۱۔ لونڈی، غلام اور ان کے تصرّفات۔

۲۔ بیوی اور اس کی طلاق۔

۳۔ قسم اور قسم شکنی۔

غلاموں کے بارے میں بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور میں مسلمان معاشرے میں غلاموں کی کثرت تھی، اور اسی کثرت نے فقہاء کے خیالات کو ان کی طرف مبذول کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ معاملات کا کوئی باب ایسا نہیں کہ جس کے اکثر مسائل کی بنیاد، لونڈی اور غلام پر نہ ہو، بیع، اجارہ، شراکت، رہن، وصیّت اور عتق وغیرہ کے ابواب کے تحت انہی غلاموں کے متعلق ڈھیر سارے مسائل نظر آئیں گے۔ اسی طرح اگر ایک ہذیانی یا پاگل آدمی سے بھی، مسائل کا وقوع تصوّر میں آسکے، تو اس کا جواب بھی تیار کر دیا گیا تھا، تاکہ اگر مفتی یا قاضی سے ایسے مسائل کے بارے میں پوچھا جائے تو اس کا جواب دینے میں اسے کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ رہی یہ بات کہ ان میں سے اکثر مسائل کے وجود کا تصوّر تک ناممکن ہے، تو اس سے تعجب اور بڑھ جاتا ہے

اور ان پر جو وقت صرف کیا گیا، اس پر سخت افسوس ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ تفریع مسائل، اس دَور کا خاصہ ہے اور صحابہ و تابعین کا یہ طریقہ نہ تھا بلکہ اس کے برعکس جس مسئلہ کا عملاً وجود نہ ہوتا تھا، وہ اس کا جواب دینے کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ ۱۰؎

قرآن حکیم نے غلامی کے رواج کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ سورۃ محمد میں اس بارے میں حکم موجود ہے:۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً۔ ۱۱؎

(ترجمہ) تو احسان کرکے قیدیوں کو چھوڑ، یا فدیہ لے کر۔

اور پھر قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی ان کا ذکر آیا، وہ ماضی کے صیغے میں آیا۔ یعنی وہ غلام جو آپ کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ اسلام نے غلامی کے ختم کرنے کے مختلف طریقے وضع کئے، پہلے سے موجود غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے زکوٰۃ کی ایک مد مخصوص فرمائی۔ اس لئے اسلام کی ان تعلیمات کے مطابق اب لونڈی، غلاموں کا وجود ناپید ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ان شرعی احکامات کے برعکس، ان کی تعداد پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ یہ لونڈیاں اور غلام دراصل اس دَور کے امراء کی عیش پرستی کا ایک ذریعہ تھیں۔ اور پھر یہ عیش پرستی یہیں تک نہ رُکی۔ اس کا ایک لازمہ شراب نوشی بھی تھا۔ جسے شریعتِ اسلامی نے قطعاً حرام قرار دے دیا تھا۔ اب اگر اسلام کا عدالتی نظام، دَورِ اوّل کی طرح سادہ اور قرآن و حدیث تک محدود رہتا تو اس بات کا کم امکان تھا، کہ امّتِ مسلمہ اس قسم کی عیاشیوں کا شکار ہو جاتی

۱۰؎ تاریخ فقہ اسلامی مطبوعہ لکھنؤ (اردو ترجمہ التاریخ التشریع الاسلامی) صفحہ ۳۷۹

۱۱؎ سورۃ محمد۔ پارہ ۲۶ (آیت ۴)۔

لیکن جیسا کہ کتاب الحیل کے تعارف میں گزر چکا ہے ۔ مسلمان معاشرے میں تقوے کے خاتمے کے نتیجے میں ایسی صورتِ حالات پیدا ہو چکی تھی، کہ لوگوں نے شرعی احکامات سے بچنے کے لئے ہزاروں حیلے تراش لئے تھے ۔ سرمایہ داری نظام کا جواز پیدا کر لیا گیا، اور شراب جیسی حرام چیز کی اسلامی قانون میں ایسی طرح تشریح کی گئی کہ شرابی پر حد نافذ کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی ۔ دوسری کتابیں تو جانے دیجئے، حنفی فقہ کی معتبر کتاب "ہدایہ" کی کتاب الاشربۃ تک میں یہی تشریح موجود ہے ۔ ملاحظہ فرمائیں :-

"شہد، انجیر، گندم، باجرہ اور جَو کی نبیذ حلال ہے، چاہے وہ پکائی بھی نہ گئی ہو، اور یہ فتویٰ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہما کا ہے، شرط یہ ہے کہ ان کا استعمال لہو و لعب کے لئے نہ ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ شراب صرف ان دو درختوں کے پھلوں سے بنتی ہے اور آپ نے انگور اور کھجور کی طرف اشارہ کیا تھا اور حرمت کا حکم ان دونوں کے ساتھ مخصوص کیا تھا" اور یہ فتویٰ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو نشہ آور مشروب گندم، جو، شہد اور باجرے سے بنایا جائے، وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حلال ہے ۔ اور اس کے پینے والے پر کوئی حد نہ ہو گی، اور خلیطین (ایک قسم کی شراب جو کھجور اور انگور کے عرق کو ملا کر بنائی جاتی ہے) کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ ابن زیاد سے روایت کی گئی ہے کہ "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے ایسا مشروب پلایا کہ میں نشے کی وجہ سے گھر کا راستہ نہیں پا سکتا تھا" اور اگر انگوروں کا رس اس طرح پکایا جائے کہ اس کا دو تہائی خشک ہو جائے تو ایسا مشروب

بھی حلال ہے، چاہے وہ کتنے نشے والا ہی کیوں نہ ہو۔" [۱۲]

بعض مفتیوں کی طرف سے اس قسم کی رعایت دینے کی وجہ سے مختلف شہروں کے قاضیوں کے فیصلوں میں یکسانیت پیدا نہ ہو سکی، اور وہی پہلے جیسا اختلاف کہ جسے ابن المقفع نے محسوس کرتے ہوئے اسلامی قانون کی سرکاری سطح پر تدوین کی تجویز پیش کی تھی۔ اب پہلے سے بھی زیادہ شدت سے سامنے آ گیا۔ ایک شہر کا قاضی اگر حنفی فقہ کے مطابق فیصلہ کرتا تو دوسرے شہر کا قاضی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ سے راہنمائی حاصل کرتا، اور تیسرے شہر کا قاضی، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ کو فوقیت دیتا ہے۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے مؤطا امام مالک کو جو سرکاری حیثیت دینے کی کوشش کی تھی، معلوم نہیں کہ اندرونِ خانہ کن رکاوٹوں کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا، لیکن اگر ایسا ہو جاتا، تو اسلامی قانون اور اس کے عدالتی نظام کی تاریخ مختلف ہوتی، اور امتِ مسلمہ ایک بہت بڑے بوجھ سے بچ جاتی۔ تاہم اس وقت تو اس تجویز پر عمل نہ کیا گیا، لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد محسوس کیا گیا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں، اور ایک مرکزی عدالتی نظام کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کیا گیا۔ جس کے لئے ایران کے عدالتی نظام کی طرح قاضی القضاۃ کا عہدہ وجود میں لایا گیا۔

---

[۱۲] ہدایہ آخرین مطفائی صفحہ ۴۸۱ تا ۵۰۱ - یا - شرح فتح القدیر مطبوعہ مصر جلد ہشتم صفحہ ۱۶۱

عدالتی نظام کی مرکزیت کیلئے قاضی القضاۃ کا عہدہ

دَورِ نبویؐ کے قاضی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ خلفائے راشدین اور بنو امیہؓ کے زمانے میں بھی ابھی تک عربی سادگی موجود تھی۔ دلوں پر تقویٰ کا اثر تھا، اس لیے قاضیوں کی تعداد بھی بڑی محدود تھی اور ان کے سامنے پیش ہونے والے تنازعات بھی اسی نسبت سے کم تھے۔ اس لیے ان کے دَور میں قاضی القضاۃ کے عہدے کی نہ تو ضرورت تھی، اور نہ ہی اس کا وجود ملتا ہے۔ ان ادوار میں تمام قاضیوں کو ایک ہی سطح پر رکھا جاتا تھا، اور کسی قاضی کو کسی دوسرے قاضی پر کوئی امتیاز حاصل نہ ہوتا تھا۔ بنو امیہ کے دورِ خلافت میں دار الخلافہ کے قاضی کو خلیفۂ وقت خود مقرر کرتا تھا، لیکن اسے بھی، مملکت کے دوسرے قاضیوں پر نہ تو کوئی خصوصی امتیاز حاصل ہوتا تھا، اور نہ ہی دوسرے شہروں کے قاضیوں کے تقرر یا تبادلے میں اس کا کوئی ہاتھ ہوتا تھا۔ عباسی دَور میں جب اسلامی قانون کی تدوین شروع ہوئی، تو اس وقت پہلی دفعہ قاضی القضاۃ کے لفظ کا وجود ملتا ہے۔

فقہ کی ان نئی مدون شدہ کتابوں میں عام قاضیوں کے اختیارات اور فرائض کے ساتھ ساتھ قاضی القضاۃ کے اختیارات و فرائض کا تعین بھی کیا گیا۔ اپنے اس محکمے یعنی عدلیہ میں قاضی القضاۃ مختارِ کل ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے قاضی القضاۃ کے اختیارات موجودہ زمانے کے چیف جسٹس اور وزیر قانون دونوں کے

اختیارات سے بھی زیادہ ہوتے تھے، اسے مملکت کے مختلف حصّوں میں قاضی مقرر کرنے، اور انہیں معزول کرنے کا اختیار تھا، دیگر قاضیوں کے برعکس اسے اپنا نائب مقرر کرنے کی اجازت بھی تھی۔ قاضیوں کے فیصلوں کی پڑتال اور ان کے ہر قسم کے کام کی نگرانی اس کے ذمّے تھی۔ یہ عہدہ سب سے پہلے خلافتِ عباسیہ کے دور میں بغداد میں قائم کیا گیا، اور اس کی افادیّت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مملکت کے دوسرے حصّوں میں بھی اس کا رواج ہو گیا۔

اسلام کے عدالتی نظام میں سب سے پہلے قاضی القضاۃ کے طور پر امام ابو یوسفؒ کا نام ملتا ہے۔ آپ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے۔ آپ کو عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے یہ عہدہ سونپا تھا، اسلامی تاریخ کی کتابوں میں آپ کی تقرری کی تاریخ ۱۷۰ھ دی ہوئی ہے۔ یعنی حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے پورے بیس سال بعد، اسی سال ہارون الرشید تختِ خلافت پر بیٹھا تھا۔ اور اقتدار سنبھالتے ہی اس نے اس عہدے کی پیش کش امام ابو یوسفؒ کو کر دی تھی۔

قاضی القضاۃ کا مرتبہ اس قدر بلند ہوتا تھا کہ مملکت کے مختلف صوبوں یعنی عراق، خراسان، شام، مصر غرضیکہ تمام بلادِ اسلامیہ میں اس وقت تک کوئی شخص قاضی مقرر نہ ہو سکتا تھا، جب تک کہ امام ابو یوسفؒ اس کی منظوری نہ دے دیتے تھے، تمام شرعی احکامات کے متعلق اسے قطعی فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا تھا، اس عہدے کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ مملکت کے تمام قاضی ایک ہی فقہی مذہب کے پیروکاروں میں سے منتخب کئے جانے لگے اور ظاہر ہے کہ یہ وہی فقہی مذہب ہوتا، جس کا پابند خود قاضی القضاۃ ہوتا۔ چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں تمام قاضیوں کا تعلق حنفی فقہ سے تھا،

اور وہ لازماً حنفی فقہ کے مطابق ہی فیصلے کرتے تھے۔ اس کا ایک مثبت نتیجہ تو ضرور نکلا کہ پوری اسلامی مملکت کے عدالتی نظام میں ایک قسم کی مرکزیت پیدا ہوگئی اور مختلف علاقوں کے قاضیوں کے متضاد فیصلوں کی وجہ سے عدالتی نظام میں جو گڑبڑ پیدا ہو رہی تھی، وہ تقریباً ختم ہوگئی۔

تاہم یہ خوشگوار صورتِ حالات صرف اس وقت تک قائم رہی کہ جب تک اسلامی سلطنت کا شیرازہ منتشر نہ ہوا تھا اور تمام علاقے ایک ہی مرکزی حکومت کے تابع تھے لیکن جب سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونا شروع ہوا اور مختلف علاقوں نے مرکز سے علیحدگی اختیار کر کے خود مختاری حاصل کر لی تو قاضی القضاۃ کا عہدہ پہلے جیسا مؤثر نہ رہا۔ بلکہ ہر علاقے کے امیر نے اپنے علاقے کے لئے علیحدہ قاضی مقرر کر لئے جن کا دارالخلافہ سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ تاہم جب تک مرکزی حکومت میں کچھ بھی جان باقی رہی، تو صرف بغداد کے قاضی ہی کو قاضی القضاۃ کو اس اہم لقب کا مستحق سمجھا جاتا۔ کیونکہ وہی تمام مملکت کے قاضیوں کی نگرانی کا کام سرانجام دیتا تھا۔

مختصر یہ کہ عباسی دور اگرچہ اسلام کا ایک سنہری دَور شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اوپر دی گئی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا عدالتی نظام اپنے بنیادی اصول یعنی مساواتِ انسانی سے کچھ ہٹنا شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ عامۃ المسلمین میں تقویٰ کی کمی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عدالتی نظام دن بدن سادگی سے دُور ہوتا چلا گیا، اور سرمایہ داری نظام میں تنازعات اور دوسرے مقدمات میں اضافہ ہونا، ایک فطرتی امر تھا، اس لئے اس دَور میں عدالتی نظام پہلے ادوار کی نسبت پیچیدہ ہوگیا۔ اور عام آدمی کو انصاف حاصل کرنے میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

عبّاسی دَور کے مشہور قاضی

اس دَور میں اگرچہ بہت سے قاضیوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی، لیکن اختصار کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان میں سے چند اہم ترین حضرات کا ذکر کیا جائے گا:۔

۱۔ قاضی ابو یوسف رح

حنفی فقہ کے دوسرے بانی امام ابو یوسف رح یعقوب بن ابراہیم انصاری ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے، اور جوان ہونے کے بعد روایتِ حدیث کرنے لگے، چنانچہ ہشام بن عروہ، ابو اسحاق شیبانی، عطا بن سائب اور ان کے طبقے کے لوگوں سے روایت کی۔ اس کے بعد ابن ابی لیلیٰ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، اور ان کے ساتھ ایک مدّت تک قیام کیا، اس کے بعد امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں آئے، اور ان کے اکابر تلامذہ اور بہترین مددگاروں میں شمار کئے جانے لگے۔ وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے امام ابو حنیفہ رح کے مذہب میں کتابیں تصنیف کیں، مسائل قلمبند کروائے۔ اور ان کی اشاعت کی اور پھر اپنے اثر و رسوخ سے تمام اسلامی دنیا میں امام ابو حنیفہ رح کی فقہ کو رائج کیا۔ بہت سے اصحاب حدیث نے بھی امام ابو یوسف رح کی تعریف کی ہے۔ حالانکہ وہ اصحاب الرائے کے بارے میں بہت کم تعریفی الفاظ منہ سے نکالتے تھے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اصحاب رائے میں امام ابو یوسف رح سے زیادہ کثیر الحدیث اور صحیح الروایت کوئی شخص نہیں۔ اور ان کی بابت یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صاحب حدیث اور صاحب السنۃ تھے۔ آپ نے ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔

امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ نے غریب گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے، کہ غربت اور تنگدستی کے باوجود مجھے علم حدیث اور فقہ حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ایک دن میں امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں بیٹھا ہوا تھا، کہ میرے والد آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر پہنچ کر مجھے کہنے لگے کہ بیٹے ابو حنیفہ رح کو تو اللہ تعالیٰ نے حصولِ معاش کے جھنجٹ سے آزاد کر دیا ہے لیکن تم تو غریب باپ کے بیٹے ہو، روزگار کی تلاش میں جب میں گلی کوچوں میں پھرنے لگا، تو امام ابو حنیفہؒ نے مجھے بلا کر میرا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور میں بڑے اطمینان سے فقہ کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔

امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے فقہی مذہب کے مطابق فقہ کی کتابیں تالیف کیں۔ اور اپنے استاد کے بیان کردہ مسائل کی باقاعدہ تدوین کر کے انہیں اطرافِ عالم میں پھیلایا۔ تاہم ان میں سے صرف ایک کتاب "کتاب الخراج" آئندہ نسلوں تک پہنچ سکی ہے۔

عمار بن ابی مالک رح کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے ساتھیوں میں امام ابو یوسفؒ کی مانند اور کوئی نہ تھا۔ اگر امام ابو یوسف رح نہ ہوتے تو امام ابو حنیفہ رح اور محمدؒ بن ابی لیلیٰ رح کا ذکر گوشۂ گمنامی میں مستور ہو جاتا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ امام ابو یوسفؒ کو مجتہد کا درجہ حاصل تھا، لیکن ان کا اجتہاد زیادہ تر امام ابو حنیفہ رح کے مذہب کے موافق ہوا کرتا تھا۔ اپنے استاد اور ولیِ نعمت کا انہیں اس درجہ احترام اور ادب ملحوظِ خاطر تھا کہ انھوں نے ان سے الگ کسی مستقل مکتبۂ فکر کی بنیاد نہیں رکھی، بلکہ اپنے مذہب کو امام ابو حنیفہ رح کے مذہب کے تابع رکھا۔ آپ مسلسل تین عباسی

حکمرانوں المہدی ، الہادی اور ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی کے منصب پر فائز رہے ، لیکن انہیں شہرتِ دوام ہارون الرشید کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ ہارون الرشید ان کی بیحد تعظیم و تکریم کرتا تھا ، اور ہر اہم معاملے میں ان سے مشورہ لینا ضروری سمجھتا تھا۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو بعض ایسی خصوصیات حاصل تھیں ، جو دوسرے قاضیوں میں نہیں تھیں :۔

۱۔ قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس کا لقب سب سے پہلے آپ کے لئے استعمال کیا گیا۔

۲۔ سب سے پہلے قاضی صاحب نے علماء اور غیر علماء کے لباس میں سرکاری اور قانونی طور سے فرق و امتیاز پیدا کرنے کے لئے خاص لباس ضروری قرار دیا ، جسے غیر علماء استعمال نہیں کر سکتے تھے۔

۳۔ وہ پہلے قاضی القضاۃ ہیں ، جنہیں تمام مملکت میں قاضیوں کے تقرر اور انہیں ملازمت سے برخاست کرنے کے مکمل اختیارات تھے۔

۴۔ سب سے پہلے انہوں نے مملکت کا دورہ کر کے قاضیوں کی کارگزاری اور حالات کی چھان بین کرائی۔

۲۔ قاضی یحییٰ بن اکثم

آپ خلیفہ مامون کے قاضی القضاۃ تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب اکثم بن صیفی حکیم العرب سے جا ملتا ہے۔ بغداد میں پرورش پائی اور وہاں کے علماء سے علم حاصل کیا۔ آپ کو بہت ہی چھوٹی عمر میں قاضی کا عہدہ سونپ دیا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ اہلِ بصرہ نے آپ کی چھوٹی عمر کی وجہ سے آپ کا مذاق اڑانا چاہا ،

تو آپ نے فرمایا کہ میں عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ سے عمر میں بڑا ہوں، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ اسی طرح میری عمر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی مقرر فرمایا تھا۔

علم حدیث اور دوسرے تمام علوم میں آپ یگانۂ عصر تھے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ اور امام دارقطنیؒ نے آپ سے کئی روایات بیان کی ہیں۔ [۱۳]

مشہور مالکی فقیہہ ابو اسحاق، اسماعیل بن حماد فرماتے ہیں کہ فقہ میں یحییٰ کی کتابیں بڑی مستند اور پایہ کی تھیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب ان کی سرپرستی باقی نہ رہی، تو لوگوں نے آپ کی کتابوں کو بھلا دیا۔ معاصرین نے حسد کی وجہ سے کئی باتیں آپ کے خلاف مشہور کر دی تھیں۔ جن میں سے ایک الزام یہ تھا کہ آپ خلیفہ مامون کے ساتھ مل کر شراب نوشی کا شغل فرمایا کرتے تھے۔ ابن خلدون نے اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ اس طرح ان پر غلمان پرستی کا الزام بھی غلط تھا۔ بہرحال حاسد کامیاب ہو گئے اور خلیفہ مامون کو آپ سے بدول کر دیا۔ ویسے مامون کی ناراضگی کا اصل سبب مسئلہ خلق قرآن میں ان کی مخالفت تھی۔ قاضی صاحب کہا کرتے تھے، کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اسے مخلوق کہے گا وہ گردن زنی کے لائق ہے۔ یہ عقیدہ مامون کے عقیدے کے خلاف تھا جو قرآن مجید کو مخلوق قرار دیتا تھا۔ اس لئے اسے قاضی کے عہدے سے برخاست کر دیا گیا۔ [۱۴]

---

[۱۳] تاریخ القضاء فی الاسلام تالیف ابن عرنوس۔ مطبوعہ مصر۔ صفحہ ۱۸۰

[۱۴] 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۸۲

نواں باب

عثمانی دَور میں عدالتی نظام پر منفی اثرات

اس دَور کی مختصر سیاسی حالت

عثمانی دَور میں عدالتی نظام پر منفی اثرات کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ اس دَور کی سیاسی صورتِ حالات کو سامنے رکھا جائے، بنو عباس کے پہلے نو حکمران کافی طاقتور اور نامور تھے۔ اس کے بعد ان کی حکومت کمزور ہوتی گئی اور مختلف گروہ اس میں اقتدار حاصل کرتے رہے۔ تاہم اس کمزوری کے باوجود چوتھی صدی کے آخیر تک حکومت کا معاملہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ لیکن اس کے بعد مملکت کے مختلف صوبوں کے تعلقات میں گڑبڑ پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ رفتہ رفتہ کئی صوبوں کے امراء نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا:۔

۱۔ بغداد میں خلیفہ برائے نام تھا، اور حکومت کے تمام اختیارات بنو بویہ کے پاس تھے۔

۲۔ شمالی افریقہ میں خلافتِ فاطمیہ پہلے ہی قائم ہو چکی تھی، اور اندلس میں بنو امیہ خاندان کے عبدالرحمٰن ناصر نے سلطنتِ عباسیہ کو کمزور محسوس کرتے ہی اپنے لئے امیر المؤمنین کا لقب اختیار کر لیا۔

۳۔ شام میں محمد الاخشید قریب قریب خود مختار سلطان بن گیا۔

۴۔ اور روسی ترکستان کے علاقے میں سلطنتِ سامانیہ قائم ہو چکی تھی۔

اس طرح عالمِ اسلامی کے تمام جوڑ بند ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ دشمنانِ اسلام اس تاک میں تھے، چنانچہ مغلوں نے چنگیز خان کی قیادت میں سیلابِ بے پناہ کی طرح اسلامی ممالک کا رخ کیا اور جو لوگ بھی ان کے مقابلے میں آئے، انہیں ختم کر دیا گیا، اور مغل تھوڑے ہی عرصے میں مشرقِ بعید میں ساحلِ چین سے لے کر مغرب بعید میں بحیرہ روم کے ساحل تک تمام دنیا کے مالک ہو گئے۔ ابھی تک عباسی خلافت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور عباسی خلیفہ اگرچہ نام کا تھا، لیکن اس کے باوجود اکثر اسلامی علاقوں میں جمعہ کے خطبات میں اس کا نام لیا جاتا تھا۔ لیکن آخر میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے یہ چراغ بھی بجھا دیا اور بہت سی تباہی و بربادی کے بعد بغداد ایک ایسی حکومت کا دارالخلافہ بن گیا جس کا کوئی آسمانی مذہب نہ تھا۔ اس لئے کچھ عرصے کے لئے اسلام کا عدالتی نظام بھی معطل ہو کر رہ گیا۔ چنگیز خان کے چند وضعی قوانین تھے، جو "کاسہ" کے نام سے مشہور تھے، انہیں کے مطابق عدالتوں کے فیصلے ہونے لگے۔ تاہم اسی عرصے میں مصر میں ترکی غلاموں نے کافی اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے اسلامی خلافت کا نام زندہ رکھنے کے لئے عباسیوں کی اولاد میں سے ایک شہزادے کو برائے نام خلیفہ بنا دیا۔ لیکن اصل طاقت ایک ترک سردار بیبرس کے ہاتھ میں رہی۔

اس کے بعد وسط ایشیا کی ترکی اقوام جو مختلف قبائل سے مرکب تھی، نے انگڑائی لی۔ تو اس نے بھی بہت سے اسلامی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے راستے میں کوئی ایسی قوم نہ پائی، جو انہیں روک سکتی۔ یہاں تک کہ وہ بلادِ شام تک پہنچ گئے، لیکن مصر کہ جس پر پہلے ہی ترکوں کا قبضہ تھا، نے ان کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دی، جس کی وجہ سے مصر اور شام ان کے غلبے سے

محفوظ رہ گئے۔ لیکن باوجود ان کی کامل فتح کے اور اکثر اسلامی ممالک پر غلبہ حاصل کر لینے کے اسلامی قوّت نے مغل باغیوں کی گردن جھکا دی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے میں ان کی قسمِ شمالی جو دریائے "وتل" پر مقام سرائے میں تھی، اور قسمِ غربی جو بغداد اور ایرانی ممالک میں رہتی تھی، دونوں برابر تھیں۔ لیکن قسمِ شمالی نے ایک صدی پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مصر و شام پر جس قوم کا قبضہ تھا وہ بھی ترکی تھی، اور یہی لوگ اسلامی تاریخ میں ممالیک کے نام سے مشہور ہوئے۔

مغربی افریقہ کے ممالک کے علاوہ کہ جس میں بربروں کی حکومت تھی۔ تمام اسلامی ممالک پر ترکوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اور آٹھویں صدی کی ابتداء میں ترکی ایشیا میں ایک بلند ہمت اور بہادر آدمی یعنی عثمان کجق جو ایک ترکی قبیلے کا سردار تھا نمایاں ہوا، اور اس نے اپنی قوم کے لئے بقایائے آلِ سلجوق کے کھنڈر پر، جو ہمیشہ ایشیائے وسطیٰ میں رہتے تھے، ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ وہ اور ان کے بعد ان کی اولاد آس پاس کے چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قبضہ کرتی رہی۔ یہانتک کہ ان کی ایک بڑی سلطنت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے یورپ پر حملہ کیا، اور اس کے ایک بڑے حصّے پر قابض ہو گئے۔ نویں صدی کے نصف حصّے میں، ان کے ہاتھوں، قسطنطنیہ کا شہر فتح ہوا، جو بعد میں ان کا دارالسلطنت ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں کو اپنے زیرِ اثر لانے کا فیصلہ کیا۔ جس میں سب سے بڑی سلطنت مصری سلطنت تھی، جو خلافتِ اسلامیہ عباسیہ کا مرکز تھی۔ اور اس پر غلبہ حاصل کر کے، آخری عباسی خلیفہ کو وہاں سے ہٹا دیا، اور خود ترک حکمرانوں کو اسلامی خلفاء کے لقب سے ملقب کرنا شروع کر دیا۔ اسطرح خلافت قاہرہ سے منتقل ہو کر قسطنطنیہ

میں آ گئی۔

دولتِ عثمانیہ میں دن بدن وسعت ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ تمام بڑے بڑے اسلامی صوبے اس کے زیرِ اقتدار آ گئے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت یہ افسوسناک تاریخی واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ بلادِ اندلس میں اسلام کا چراغ، جو آٹھ صدی تک علم و آداب کے ساتھ روشن رہ چکا تھا، وہ بجھ گیا۔

علمی ترقی لیکن عدالتی نظام میں تنزل

اس دور میں اگرچہ مسلمانوں کے سیاسی حالات کافی دگرگوں تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے علمی میدانوں میں کافی ترقی کی۔ اس کی دو وجوہات تھیں، ایک تو یہ کہ اسلامی قانون کی تدوین مختلف فقہی مذاہب کی شکل میں ہو چکی تھی جس پر بعد کے علماء نے کوئی اضافہ کرنا مناسب نہ سمجھا، اس لئے انہوں نے اپنے ذہن دوسرے علوم کی طرف منتقل کر دیئے، اور ان میں خاطر خواہ ترقی کی۔ اسلامی قانون کی تدوین کے بعد ان میں سے بعض مذاہب کو دوسرے مذاہب کی نسبت زیادہ فروغ حاصل ہونا شروع ہوتا تو اس کے مقلد ایک دوسرے پر فخر کرنے لگتے۔ جس کے نتیجے میں ان میں مناظرہ بازی کا بازار گرم ہو گیا۔ بعض اوقات ایک ایک مناظرہ، چھ چھ ماہ تک جاری رہتا تھا۔

اسلامی قانون میں تقلید کا غلبہ

فقہ کی اگرچہ تدوین ہو چکی تھی، لیکن اجتہاد کا دروازہ بھی ابھی تک کھلا تھا، اور کچھ اہل علم ایسے تھے، جنہوں نے اجتہاد کا عَلم بلند کر رکھا تھا۔ لیکن جب عدالتی نظام کے مقاصد کے لئے مختلف فقہی مذاہب کی سرکاری سرپرستی شروع ہوئی، تو لوگوں نے اپنے آپ کو ایک ہی فقہ تک محدود کر لیا۔ وہ اپنے پسند کی فقہ کی کتابیں

پڑھتے اور اس طریقِ کار کا مطالعہ کرتے، جس کے ذریعے اس میں مدوّن احکامات مستنبط کئے گئے تھے، اور جب کوئی صاحب یہ کام پورا کر لیتا تھا، تو اس کا شمار علمائے فقہ میں ہونے لگتا۔ ان میں سے بعض بلند ہمت لوگ اپنے پسندیدہ فقہی مذہب کے امام کے احکامات سے متعلق کتابیں بھی تالیف کرتے تھے، جو یا تو کسی گزشتہ کتاب کا اختصار یا اس کی شرح یا ان مسائل کا مجموعہ ہوتی تھیں جو مختلف کتابوں میں منتشر طور پر پائے جاتے تھے، لیکن ان میں سے خود کوئی شخص اپنے لئے یہ جائز نہیں سمجھتا کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے مخالف ہو، جس کا فتویٰ اس کے امام نے دیا ہو۔ گویا حق صرف اس کے امام کے دل و زبان پر اترا تھا۔ یہانتک کہ اس دور میں فقہائے حنفیہ کے ایک پیشوا اور مسلّمہ امام، جناب ابوالحسن عبید اللہ الکرخی نے یہ کہہ دیا کہ ہر وہ آیت جو اس طریقے کے مخالف ہو، جو ہمارے آئمہ کا ہے تو اس کی تاویل کی جائے گی۔ وگرنہ اسے (نعوذ باللہ) منسوخ سمجھا جائے گا۔ اور یہی معاملہ حدیث کے ساتھ کیا جائے گا۔ [۱]

مختصر یہ کہ اس دور کے علماء میں سے ہر ایک نے ایک معین فقہی مذہب کا التزام کر لیا تھا، جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اور اجمالاً اور تفصیلاً وہ اپنی پوری قوت و طاقت، اس مذہب کی تائید میں صرف کرتا تھا۔ حالانکہ مختلف فقہی مذاہب کے بانی آئمہ اپنے آپ کو معصوم نہیں سمجھتے تھے اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے تھے؛ بلکہ یہ اعلان کرتے تھے کہ اگر کوئی حدیث موجود ہو، جس سے انہیں واقفیت حاصل نہ ہو سکی ہو، تو اس پر عمل کیا جائے۔

---

[۱] تاریخ فقہ اسلامی از علامہ خضری اردو ترجمہ صفحہ ۴۲۱

تقلید عباسی دَور کا تحفہ ہے

دراصل عباسی دور کا عدالتی نظام ہی اسلامی قانون میں تقلید کے آغاز کا سبب ہوا، گزشتہ ادوار میں، ایسے لوگوں کو قاضی منتخب کیا جاتا تھا جو قرآن و سنت کا مکمل علم رکھتے تھے، اور ان دونوں ذرائع سے احکام کے استنباط کرنے کی قدرت بھی رکھتے تھے۔ ان سے یہ عہد بھی لیا جاتا تھا کہ جس چیز کے متعلق نص موجود ہو۔ اس میں صرف نصوص پر عمل کریں یا اس رائے سے کام لیں، جو نص کے قریب ہو۔ اور جب کسی خاص واقعے میں قاضیوں کو صحیح بات کا علم نہ ہوتا تھا، تو وہ اس بارے میں اپنے شہر کے دوسرے قاضیوں سے مشورہ کر لیتے تھے۔ بسا اوقات وہ اسلامی خلیفہ سے خط و کتابت کے ذریعے بھی مشورہ کرتے رہتے تھے۔ ان قاضیوں پر عامتہ المسلمین کو بڑا اعتماد تھا۔

لیکن عباسی دَور میں، تقویٰ کی کمی کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے، کہ قاضی حضرات عوام میں اپنے اس اعتماد کو قائم نہ رکھ سکے۔ اپنے اس کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے ان قاضیوں نے یہ کوشش کی کہ وہ اپنے عدالتی فیصلوں کو ان معروف فتوؤں میں مقید کر دیں۔ جو مختلف فقہی مذاہب کے آئمہ نے مدون کر دیئے تھے۔ پھر ان فقہی مذاہب کے آئمہ تقریباً تمام مشہور اسلامی شہروں میں موجود تھے۔ جس سے لوگوں کے دلوں میں یہ میلان پیدا ہوا کہ ان کا قاضی ضرور کسی مشہور فقہی مذہب کا عالم ہو اور اپنے فیصلے میں اس کی پیروی کرے اس سے تجاوز نہ کرے، اور وہ فقہی مذہب ایسا ہو کہ جس کی تدوین کی جا چکی ہو۔ اور ساتھ ہی وہ مشہور بھی ہو۔ اس طرزِ عمل کے نتیجے میں ایسے فقہی مذاہب کا کلی طور پر خاتمہ ہو گیا، جن کے متبعین نے، ان کی تدوین و تہذیب میں سرگرمی نہ

دکھائی، تاکہ اس پر عمل کرنا آسان ہو، اور جب کسی خاص فقہی مذہب کی تقلید، کسی بادشاہ یا سلطان نے کی اور قاضیوں کے عہدے بھی صرف اسی فقہی مذہب کے علماء کو سونپے گئے، تو یہ اقدام اس مذہب کی وسیع اشاعت اور اس کے علماء میں اضافے کا اہم سبب بن گیا۔ جیسا کہ بلادِ مشرق میں محمّد بن سبکتگین اور نظام الملک نے اور مصر میں صلاح الدین یوسف بن ایّوب نے شافعی مذہب کی تائید کی۔ جب کہ حنفی مذہب کی تائید ترک سلاطین نے کی۔ جو حنفی فقہ کے سوا، کسی دوسری فقہ کو اختیار نہیں کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے رسالہ "انصاف فی بیان اسباب الاختلاف" میں شیخ بلقینی کے شاگرد جناب ابوزرعہ کا قول بیان کرتے ہیں کہ اس نے ایک دفعہ اپنے شیخ امام بلقینی سے دریافت کیا کہ شیخ تقی الدین سبکی، اجتہاد کے درجے کو کیوں نہیں پہنچے، حالانکہ انہیں یہ درجہ حاصل تھا، اور وہ کیوں تقلید کرتے رہے، لیکن وہ خاموش رہے تو میں نے کہا، کہ میرے نزدیک اس کی وجہ صرف وہ سرکاری وظائف اور تنخواہیں تھیں جو چاروں فقہی مذاہب کے فقہاء کو ملتی تھیں، اور جو شخص ان مذاہب کے دائرے سے نکل کر اجتہاد کرتا تھا، اسے وہ وظیفہ نہیں ملتا تھا، اور ساتھ ہی اسے قاضی کے عہدے سے بھی محروم ہونا پڑتا تھا۔

جامد تقلید کے خلاف ردِّ عمل

عباسی دَور کے آخر میں اور اس کے خاتمے کے کچھ عرصے بعد تک، جب تقلید کی جڑیں، اسلامی معاشرے میں زیادہ مضبوط ہوگئیں، تو اس کے خلاف ردِّ عمل کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ خود انہی مذاہب اربعہ میں سے بعض ایسے علماء اٹھے، جنہوں نے جامد تقلید کی سخت مذمت کی، اور انہوں نے [illegible]

کو یہ باور کرانے کی کوشش کی، کہ مسلک کے کسی امام کی طرف منسوب ہونے کے یہ معنے نہیں کہ آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلا جائے، بلکہ ان آئمہ کی تقلید کا مطلب یہ ہے کہ وہ طریقہ اجتہاد اور دلائل کے استقراء اور ان کی ترتیب میں وہ اس خاص امام کے وضع کردہ طریقہ پر چلے، اور حتی الامکان، اس کے اجتہاد کے ساتھ موافقت کرے۔ اور اگر کبھی کوئی ایسا مسئلہ آجائے کہ جس سے اس کے امام کی مخالفت ہوتی ہو تو وہ اس کی پرواہ بھی نہ کرے۔ عباسی دَور کے آخر میں ابو اسحاق شیرازیؒ، ابن الصباغؒ، امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ اس قسم کے مجتہد تھے، اور پھر جب بغداد میں عباسی خلافت کے خاتمے کے بعد مصر میں اسے زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، تو وہاں بھی اہلِ علم میں ایسی ہی روشن خیالی کی لہر آئی، اور بہت سے ایسے علمائے دین پیدا ہوئے، جنہوں نے جامد تقلید کی مذمت کر کے علماء کو اجتہاد کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی، ان بزرگوں میں عزیز بن عبد السلامؒ، ابن الحاجبؒ، ابن دقیق العیدؒ، ابن الرفعہؒ، ابن تیمیہؒ، علّامہ سبکیؒ، ابن سبکیؒ، ابن قیّمؒ، علامہ بلقینیؒ، کمال ابن الہمامؒ، جلال الدین المحلیؒ اور جلال الدین سیوطیؒ شامل تھے۔ یہ علمائے دین اگرچہ تقلید جامد کی مذمت کرتے تھے، لیکن مجتہد ہونے کے باوجود کسی نہ کسی فقہی امام سے اپنے آپ کو منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

اسلام کے عدالتی نظام کی بنیاد مساوات کا خاتمہ

اسلامی تاریخ کے پہلے ادوار کے تعارف میں بتایا جا چکا ہے، کہ اسلامی مساوات، اسلام کے عدالتی نظام کی ایک مضبوط بنیاد تھی، عباسی دَور میں جب حکمرانوں کو خاص قسم کے حقوق

عطا کرکے، انہیں عدالتی کارروائی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تو یہ اسلام کے نظامِ مساوات میں پہلی دراڑ تھی، لیکن اس دَور میں اسلام کے نظامِ مساوات کا تقریباً خاتمہ ہو گیا، اور بعد میں غالباً یہی وجوہات اسلامی مملکت کے زوال کا باعث بنیں، امام غزالی، جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، اسی دَور سے تعلق رکھتے تھے، مسلمانوں کی عیاشیاں دیکھ کر خون کے آنسو روتے تھے۔ ایک دفعہ آپ مدینہ شریف تشریف لے گئے، تو وہاں انہوں نے بڑی بڑی شاندار عمارتیں دیکھیں، جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں، اس سلسلے میں انہوں نے اپنے طنزیہ انداز سے علماء کو شرمندہ کیا، کہ جنہوں نے اسلامی مساوات کے خاتمے پر اپنی آنکھیں بند کر تی تھیں۔ چونکہ ان کی طنز کا تعلق صرف مکانات کے بارے میں تھا، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیالات نقل کرنے سے پہلے اس بارے میں شریعت اسلامی کی تعلیمات بیان کر دی جائیں۔ سنن ابوداؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زبانی روایت ہے کہ:-

"ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے، تو آپؐ نے ایک بلند گنبد نما مکان دیکھا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ یہ فلاں انصاری کا گھر ہے۔ اس پر آپؐ خاموش ہو گئے اور بات اپنے دل میں رکھی، تا آنکہ وہ صحابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بھری مجلس میں سلام کیا، لیکن آپؐ نے اسے قصداً نظر انداز کر دیا۔ آپؐ نے کئی بار ایسا ہی کیا، یہانتک کہ وہ شخص بھانپ گیا کہ آپؐ اس سے خفا ہیں اور جان بوجھ کر منہ موڑ رہے ہیں۔ اس نے صحابہ کرام کے سامنے اپنی مشکل پیش کی اور کہا خدا کی قسم، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفا نظر

آتے ہیں۔ صحابہ نے اسے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر نکلے تھے، تو آپؐ نے تیرا بلند قبہ دیکھا تھا۔ یہ بات سُن کر وہ آدمی لوٹ آیا، اور آکر اپنے گنبد نما مکان کو زمین کے برابر کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں کسی دن باہر تشریف لے گئے تو آپؐ نے اس مکان کو نہ دیکھا، دریافت فرمایا تو لوگوں نے اس کے مالک کا حال بیان کیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ آگاہ رہو، کہ ہر عمارت اپنے مالک کے لئے وبال کا باعث ہوگی، بجز اس کے جو اس کے لئے ضروری ہو۔" ؎۲

قاضی اور اسلامی مساوات

اس واقعہ سے یہ حقیقت عیاں ہو رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حکیمانہ طریقے سے اسلامی معاشرے میں مساوات قائم کی۔ لیکن امام غزالی رحؒ کے دَور میں قاضیوں اور علمائے دین کے طرزِ عمل کی وجہ سے یہ مساوات قریب قریب ختم ہو چکی تھی اور مدینہ منورہ بھی ان سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ امام غزالی رحؒ نے وہاں کے قاضیوں اور علماء کو اسلام کا نظامِ مساوات یاد دلانے کے لئے یوں شرمندہ کیا کہ ان کے سامنے بار بار ضحاک بن مزاحم کی روایت بیان فرماتے تھے۔ امام غزالی رحؒ نے اس روایت کو اپنی مشہور کتاب "احیاء العلوم الدین" میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

"ضحاک بن مزاحم فرماتے ہیں کہ سلف صالحین ایک دوسرے کو پرہیزگاری کے سوا کچھ نہیں سکھاتے تھے اور آج بجز فلسفہ کے کچھ نہیں سیکھتے اور علمائے حق کی

؎۲ سنن ابوداؤد مطبوعہ مصر جلد چہارم صفحہ ۴۸۷

ایک علامت یہ ہے کہ وہ کھانے پینے میں آسائش، لباس میں شان وشوکت اور ساز و سامان اور رہائش گاہ کے معاملے میں، زینت کی طرف مائل نہ ہوں، بلکہ ان سب امور میں میانہ روی اختیار کریں، اور اس بارے سلف صالحین سے مشابہت پیدا کریں، اور سب امور مذکورہ میں کم سے کم مقدار پہ کفایت کریں، کیونکہ جس قدر ان چیزوں کی خواہش کم ہو گی، اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ کا قرب زیادہ ہو گا۔ اور اسی طرح علمائے حق میں ان کا مرتبہ بلند ہو گا۔ اور یہ قصہ اس امر پہ شاہد ہے، جو حاتم الاصم کے شاگرد ابوعبداللہ خواص روایت کرتے ہیں، کہ وہ حاتم کے ساتھ شہر رے میں گیا۔ ہمارا قافلہ جو تین سو بیس آدمیوں پر مشتمل تھا، حج کا ارادہ رکھتا تھا۔ سب کے سب کمبل پوش تھے۔ کسی کے پاس توشہ دان یا کھانا نہیں تھا، ہم ایک سوداگر کے گھر اترے، جو زیادہ دولت مند نہ تھا، تاہم غریب دوست تھا، اس نے اس رات ہماری ضیافت کی۔ جب صبح ہوئی تو اس نے حاتم سے کہا کہ اگر ضرورت ہو تو ارشاد فرما دیجئے کہ میں اپنے شہر کے ایک بیمار فقیہہ یا مفتی کی بیمار پرسی کو جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ بیمار پرسی کار ثواب ہے، اور فقیہہ کو دیکھنا عبادت میں شامل ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، اور وہ بیمار فقیہہ محمد بن مقاتل قاضی رے تھا۔ جب ہم دروازے پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خوبصورت بلند و بالا محل تھا، حاتم یہ شان وشوکت دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ ایک مسلمان قاضی کا ایسا شاندار دروازہ، پھر اجازت کے بعد اندر گئے تو دیکھا کہ مکان خوبصورت اور بڑا وسیع تھا۔ قالین بچھے ہوئے تھے، اور پردے لگے ہوئے تھے۔ جناب حاتم پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوئے۔ پھر قاضی صاحب کے ڈرائنگ روم میں گئے، جس میں نرم قالین بچھا ہوا تھا، اور وہ اس پر لیٹے ہوئے تھے،

اور سر کے پاس ایک نوکر لڑکا پنکھا لیئے کھڑا تھا، سوداگر قاضی صاحب کے سرہانے بیٹھ کر حال احوال پوچھنے لگا۔ لیکن جناب حاتم کھڑے رہے۔ قاضی نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لیکن آپ نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس پر قاضی صاحب نے پوچھا کہ "کیا تمہیں کوئی حاجت ہے"؟ آپ نے ثبات میں جواب دیا کہ "ایک مسئلہ پوچھنا ہے"، بشرطیکہ آپ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ جب قاضی صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تو جناب حاتم نے دریافت فرمایا کہ "تم نے علم کس سے سیکھا ہے"؟ جواب دیا کہ "معتبر علمائے دین سے، جنہوں نے میرے سامنے احادیث بیان کیں"، جناب حاتم نے پوچھا کہ "انہوں نے کس سے احادیث روایت کی تھیں"؟ قاضی صاحب نے جواب دیا "صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے"۔ آپ نے پھر پوچھا کہ "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کس سے روایت کی تھیں"؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، جنہوں نے جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کیا تھا"۔

اس پر جناب حاتم نے فرمایا کہ "جو علم اللہ تعالیٰ سے جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا، اور آپؐ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو، اور انہوں نے معتبر علماء کو جنہوں نے اسے تجھ تک پہنچایا، کیا تم نے اس علم میں کہیں یہ بھی دیکھا سنا ہے کہ جس مسلمان کے گھر کی کرسی بلند ہو اور وہ بڑا وسیع ہو، تو اس کا رتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا ہوتا ہے"؟ قاضی صاحب نے کہا "نہیں میں نے ایسا کہیں نہیں سنا"۔ حاتم نے دوبارہ پوچھا "تو پھر آپ نے کیسا سنا ہے"؟ قاضی نے جواب دیا کہ "یوں سنا ہے کہ جو شخص دنیا میں زہد اختیار کرے، اور آخرت کی خواہش رکھے اور مساکین اسے محبوب ہوں اور آخرت کے لیئے تیاری کرے،

تو اس کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند ہو گا۔ حاتم نے فرمایا کہ پھر تم نے کس کی پیروی کی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کی، یا نمرود اور فرعون کی، جنہوں نے سب سے پہلے اینٹوں اور چونے سے محل بنائے تھے۔ اے عالم باطل! دنیا پر حریص اور جاہل لوگ، جو دنیا کے لئے لڑتے ہیں، وہ تمہیں جیسے لوگوں کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ ہم اگر ان علماء سے بدتر ہیں، تو اس میں کیا حرج ہے"، یہ کہہ کر جناب حاتم اس کے پاس سے چلے آئے، اور قاضی ابن المقاتل کی بیماری اور بڑھ گئی، اور شہر "رے" کے لوگوں کو قاضی اور حاتم کی گفتگو کا علم ہوا، تو انہوں نے کہا کہ قزوین کا قاضی طنافسی تو ہمارے قاضی سے بھی زیادہ عیش پرست ہے۔

اسراف کے متعلّق قاضیوں کا نظریہ

پس حاتم قصداً قزوین کے قاضی کے پاس تشریف لے گئے۔ اور سلام و رحمت کے بعد درخواست کی کہ "میں ایک عجمی شخص ہوں، مجھے وضو کی عملی تعلیم دیجئے"۔ طنافسی نے کہا: "بہت بہتر" اور نوکر لڑکے سے کہا کہ "ایک برتن میں پانی لاؤ"۔ جب پانی آگیا تو قاضی طنافسی نے بیٹھ کر وضو کیا۔ اور ہر عضو کو تین تین بار دھویا، اور پھر کہا کہ اس طرح وضو کرتے ہیں۔ جناب حاتم نے فرمایا کہ اس مسئلہ کو پختہ کرنے کے لئے آپ کے سامنے وضو کرتا ہوں۔ چنانچہ قاضی طنافسی کھڑے رہے اور جناب حاتم وضو کرنے بیٹھے اور آپ نے وضو میں اپنے ہاتھوں کو چار مرتبہ دھویا۔ قاضی طنافسی نے اعتراض کیا کہ تم نے اسراف سے کام لیا ہے۔ جناب حاتم نے پوچھا کیسے ؟ تو اس نے کہا کہ تم نے اپنے ہاتھ تین کی بجائے چار مرتبہ دھوئے۔ حاتم نے کہا: "سبحان اللہ، میں نے ایک چلو پانی میں اسراف کیا اور تم نے عیش پرستی کے ان سب

سامانوں کو جمع کرنے میں اسراف نہیں کیا۔ اب قاضی طنافسی کو اصل معاملہ سمجھ آیا کہ حاتم کا مقصد وضو سیکھنا نہ تھا، بلکہ یہی امر جتانا تھا۔ یہ سن کر وہ گھر میں داخل ہو گئے اور شرم سے چالیس روز تک گھر سے باہر نہ نکلے۔

پھر جب حاتم بغداد تشریف لے گئے، تو اہلِ بغداد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ اے ابو عبدالرحمن تم ایک عجمی شخص ہو، اور تتلا کر بات کرتے ہو، مگر جو بھی تم سے بحث کرتا ہے، اسے کاٹ کر دکھ دیتے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ میں تین ایسی خصلتیں ہیں، جن کی وجہ سے فریقِ مخالف پر غالب رہتا ہوں۔ پہلی یہ کہ جب میرا دشمن صحیح بات کہتا ہے، تو میں خوش ہوتا ہوں۔ اور دوسری یہ کہ جب وہ غلطی کرتا ہے تو مجھے رنج ہوتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ میں اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہوں کہ مخالف فریق پر کوئی زیادتی نہ کر بیٹھوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محلّات؟

پھر جناب حاتم مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے۔ اہلِ مدینہ آپ کے استقبال کو آئے تو آپ نے دریافت کیا کہ یہ کونسا مدینہ ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ یہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا محل کہاں ہے؟ تاکہ میں اس میں نماز ادا کروں۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کا تو کوئی محل نہ تھا، بلکہ آپ کا گھر تو بہت سادہ اور نیچا سا تھا۔ جناب حاتم نے اصرار کیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے محلات ہی بتا دو۔ انہوں نے کہا کہ ان کے بھی کوئی محل نہیں تھے، بلکہ ان کے مکانات تو زمین سے لگے ہوئے تھے، تو جناب حاتم نے فرمایا کہ لوگو! تو پھر یہ شہر فرعون کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ لوگ اسے پکڑ کر حاکم شہر کے پاس لے گئے اور

شکایت کی کہ یہ عجمی کہتا ہے کہ یہ فرعون کا شہر ہے۔ حاکم نے حاتم سے باز پرس کی اور پوچھا کہ "تو کس لیئے ایسا کہتا ہے"؟ جناب حاتم نے کہا "جلدی نہ کرو۔ میں ایک عجمی مسافر ہوں۔ جب شہر میں آیا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا شہر ہے، تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محل کہاں ہے؟ اور سب ماجرا تفصیلاً بیان کیا۔ پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(تمہارے لیئے اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عمدہ نمونہ تھے۔)

تو پھر تم لوگوں نے کس کا اتباع کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یا فرعون کا کہ جس نے سب سے پہلے چونے اور اینٹوں کے محل بنائے، تو حاکم شہر نے لاجواب ہو کر آپ کو رہا کر دیا۔

زینت حرام نہیں ہے

ویسے دنیاوی زینت کے مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حرام نہیں ہے، بلکہ مباح ہے، لیکن جب انسان ہر طرف سے ہٹ کر صرف زینت کا ہو جائے، تو اس سے اُنس ہو جانا لازمی امر ہے۔ اس کے بعد اس کا ترک کرنا شاق گزرتا ہے، اور زینت اختیار کرنے کی وجہ سے انسان اکثر اس کے خیال کی وجہ سے مداہنت، مخلوق کی ناجائز طرف داری وغیرہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اس لیئے احتیاط اسی میں ہے۔ کہ اس سے اجتناب کیا جائے، اس لیئے کہ جو دنیا داری میں غرق ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے صحیح سالم نہیں نکلتا۔ اگر دنیا داری میں پوری طرح منہمک ہو جانے کے باوجود سلامتی کا یقین ہوتا تو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ترکِ دنیا میں مبالغہ نہ کرتے۔ یہانتک کہ آپ نے دھاری دار کرتہ اتار دیا

تھا، اور خطبے کے دوران سونے کی انگوٹھی اتار کر پھینک دی تھی۔ [۳]

مشہور شہروں کے قاضیوں کے تعلقات کا منقطع ہونا

گزشتہ ادوار میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، قاضی عام طور پر ایسے علماء وفقہاء میں سے منتخب کئے جاتے تھے، جن کا شمار ماہرین فقہ میں ہوتا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اچھے اخلاق کے مالک ہوتے، یا ان میں کچھ اخلاقی کمزوریاں ہوتیں۔ دراصل گھر بیٹھے بیٹھے ان فقہاء کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا، بلکہ یہ لوگ اپنے شہر کے اہل علم حضرات سے، علم حاصل کرنے کے علاوہ سفر کر کے، دوسرے شہروں کے علماء سے بھی کسب علم کرتے تھے، چنانچہ ان میں بہت کم لوگ ایسے تھے، جنہوں نے ہمیشہ اپنے آبائی شہروں میں قیام رکھا ہو، اور پھر بھی ان کے فضل وکمال کا اعتراف کیا گیا ہو۔ کبار آئمہ اور محدثین ہمیشہ مشغول سفر رہتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لئے وہ کبھی ایک شہر میں اترتے تھے، تو پھر وہاں سے حدیث و فقہ کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے، دوسرے شہروں کو روانہ ہو جاتے تھے، زمانہ حج میں ان لوگوں کا اجتماع مکہ مکرمہ میں ہوتا تھا، اور ہر ایک عالم دین کے پاس علم حدیث اور فقہ کا جو سرمایہ ہوتا تھا، اس سے دوسرا فائدہ اٹھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے کے علماء میں کامل تعارف ہوتا تھا، اور باوجود مشکلات سفر کے یہ ان کے احباب میں اضافہ اور ان کے دوستانہ تعلقات کو قوی کرتا تھا۔ لیکن اس دور میں مختلف شہروں کے علماء کے تعلقات

---

[۳] احیاء علوم الدین عربی جلد دوم کتاب العلم۔ یا اردو ترجمہ بنام مذاق العارفین۔ مطبوعہ لاہور۔

منقطع ہو گئے اور حالت یہ ہو گئی کہ جس طرح ایک مصری فقیہہ یا قاضی برصغیر میں اپنے ہم عصروں سے ناواقف ہوتا تھا، اسی طرح یہاں کے قاضی و فقیہہ اپنے پڑوسی ایرانی اور عراقی قاضیوں کو نہیں جانتے تھے۔ زمانہ حج میں اگرچہ بہت سے ممالک کے علماء اکٹھے ہو جاتے، لیکن ان میں کوئی اس امر کی پرواہ نہیں کرتا تھا کہ دوسرے ممالک کے قاضیوں یا فقہاء سے واقفیت حاصل کریں یا ان سے کوئی مسئلہ روایت کریں۔ اس طرح اسلامی قانون، جو ریاست کے عدالتی نظام کی بنیاد تھی، مضبوط ہونے کی بجائے جامد تقلید کی وجہ سے اس میں ضعف کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

اسلامی قانون کی کتابوں کا اختصار

تمدن کی وسعت نے گوناگوں مشاغل پیدا کر دیئے تھے، یہاں تک کہ وہ لوگ جن کا پیشہ ہمیشہ علم حاصل کرنا ہوتا تھا۔ وہ بھی اپنے آئمہ فقہ کی کتب کو پوری طرح مطالعہ کرنے کا وقت نہیں نکال سکتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں آئمہ کی کتابوں کو مختصر کرنے کا رواج شروع ہوا۔ سابقہ سیاسی دور کے آخر میں اس کام کی ابتداء ہو چکی تھی۔ اس اختصار میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جن مسائل کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی، انہیں حذف کر دیا گیا۔ آئمہ فقہ نے جن مسائل کو غیر مرتب طور پر لکھا تھا، انہوں نے اسے ابواب کی صورت میں مرتب کیا، اور پھر بڑے بڑے علماء نے ان کی تقلید کرنی شروع کر دی۔

لیکن اس کے بعد کے دور میں اختصار نے ایک عجیب و غریب روش اختیار کی۔ اس دور کے فقہاء یہ کوشش کرنے لگے کہ بہت سے مسائل تھوڑے سے الفاظ میں جمع کر دیئے جائیں، لیکن چونکہ ان لوگوں کو عربی زبان کا صحیح

ذوق نہ تھا، اس لیئے ان کی عبارتیں، معمہ کی شکل اختیار کر گئیں۔ گویا مؤلف سمجھنے کے لیئے نہیں لکھتا تھا، بلکہ اس لیئے لکھتا تھا کہ مسائل کو جمع کر دے۔ علامہ محمد الخضری نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ فقہ اسلامی" میں اس اختصار کے کچھ نمونے دیئے ہیں۔ اگر ان نمونوں کے لفظی اردو ترجمے پیش کیئے جائیں تو وہ تمام قاری کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ ان میں سے ایک عبارت جس کا ترجمہ کچھ سمجھ میں آسکتا ہے بطورِ نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔ قاضی خلیل اپنی مختصر عبارت میں لکھتا ہے :-

"اور ناپاکی اور نجاست کا حکم مطلق نہانے سے اٹھ جاتا ہو، اور وہ، وہ ہے، جس پر بلا قید پانی کا نام آئے، چاہے وہ شبنم سے جمع کیا گیا ہو، چاہے کسی جمی ہوئی چیز کو گھلایا ہو، یا چوپایہ یا حائضہ کا یا جنبی شخص کا جھوٹا، یا ان کی طہارت سے بچا ہو، یا زیادہ ہو، اور ایسی نجس چیز سے مخلوط ہو، جس نے اسے بدل نہ دیا ہو، یا اس کے بدلنے والے کی مضرت میں شک ہو، یا چپڑنے والے تیل کی قربت سے، یا مسافر کے برتن کے تارکول کی بو، یا اس سے پیدا ہونے والی کسی چیز سے، یا اس کے تہ نشین یا کسی ڈالی ہوئی چیز مثلاً مٹی یا نمک سے بدل گیا ہو۔ چاہے وہ قصداً ڈالی گئی ہو اور نمک سے سلب زیادہ راجح ہے، اس سے نہیں، جس کا رنگ یا مزہ یا بو کسی ایسی چیز سے بدل گئی ہو، جو اس سے عموماً جدا رہتی ہے، وہ چاہے پاک ہو، چاہے ناپاک، مثلاً ملا ہوا روغن یا مصطگی کا بخارا اور اس کا حکم مثل اس کے بدلنے والے کے ہے"

یہ عبارت ایک عام عبادت یعنی وضو کے متعلق ہے کہ جس کے بارے میں عامۃ الناس کو بنیادی علم عام طور پہ پہلے ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس عبادت سے انہیں کچھ سمجھ نہیں آسکتا۔ معاملات کے بارے میں عبارتیں ایسی پیچیدہ ہوگئیں کہ خود قاضیوں کی سمجھ سے بالاتر ہوگئیں اس لئے ان کتابوں کی شرح کی ضرورت محسوس ہوئی اور پھر شرح کے حاشیوں کی اور پھر عجیب بات یہ تھی کہ اسلامی قانون کی وہ تمام کتابیں جو دوسری اور تیسری صدی ہجری میں خود فقہی مذاہب کے بانیوں یا ان کے لائق شاگردوں نے تصنیف کی تھیں، وہ اس دور میں گم نام ہوگئیں۔ اور اسلامی قانون کے طلباء کے ہاتھوں میں صرف وہ کتابیں رہ گئیں، جو اس دورِ زوال کہ جب عربی زبان کا ذوق مردہ تھا، میں لکھی گئی تھیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ایسی کتابیں، زیادہ دیر تک، زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں تھیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسلامی قانون کی بجائے یورپی قانون

سپین میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد اہل یورپ مختلف اسلامی ممالک پہ للچائی ہوئی نظریں ڈالنے لگے۔ اٹھارہویں صدی میں مشہور یورپی مہم جو کولمبس اسی غرض کے لئے سپین سے نکلا۔ اس کی ڈائری میں اس کے اپنے یہ الفاظ تھے کہ وہ دینِ مسیح کے دشمنوں کو ختم کرنے کے لئے برصغیر ہند و پاکستان جا رہا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ تقدیر اسے دوسرے برّ اعظم امریکہ کی طرف لے گئی۔ مختلف یورپی ممالک نے مختلف حیلوں بہانوں سے اسلامی دنیا کے تقریباً تمام علاقے اپنے قبضے میں کر لئے، اور جو اِکّا دُکّا باقی بچ گئے، ان کا بھی دوسرے مفتوحہ مسلمان علاقوں کے حالات سے متاثر ہونا

ناگزیر تھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے، کہ اس دور کے اسلامی معاشرے میں اجتہاد کی بجائے تقلید جامد کا رواج ہو چکا تھا، اور اس کے نتیجے میں فقہ اسلامی کی اصل کتابیں غائب ہو کر ان کے مختصر متن وجود میں آگئے تھے۔ اور پھر ان متنوں کی شرحیں، اور ان شرحوں کی شرحیں حواشی اور ضمیمہ جات اس کثرت سے تالیف ہوئے کہ کسی بھی معاملے کے بارے میں اسلامی قانون پر غور و خوض کرنا ایک دشوار کام ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت میں عثمانی حکومت کے بالکل پڑوس میں یورپ کے قوانین کی جدید طریقے سے تدوین ہو رہی تھی، جس کا اثر پڑوسی ملک پر پڑنا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر حکومت عثمانیہ نے بھی ایسے قوانین کا نفاذ ضروری سمجھا، جو زمانۂ جدید کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے مختلف یورپی ممالک کے قوانین کا مطالعہ کیا گیا۔ سب سے پہلے ۱۸۵۰ء میں فرانسیسی قانون کے مطابق قانونِ تجارت نافذ کیا گیا اور ۱۸۵۷ء میں قانونِ اراضی نافذ ہوا۔ اس کے بعد فرانسیسی قانون کے نمونے پر قانونِ فوجداری وضع کیا گیا۔ لیکن بعد میں اطالوی قانون زیادہ مفید نظر آیا، تو اس کے مطابق ترمیمیں کر لی گئیں۔ ۱۸۶۱ء میں تجارتی عدالتوں کا قانونِ اساسی نافذ ہوا۔ ۱۸۶۸ء میں بحری تجارت کا قانون۔ ۱۸۸۰ء میں عدالت ہائے دیوانی کا قانونِ اساسی بنایا گیا، اور ۱۹۱۱ء میں اس کا تکملہ وضع ہوا، اور ۱۹۰۶ء میں قانونِ اجراءِ جاری ہوا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے قوانین وضع کیے گئے۔ جیسے یتیموں کے مال کی تنظیم، اور حکامِ صلح کا قانون اور شرعی عدالتوں کا قانونِ اساسی وغیرہ۔

مختصر یہ کہ حکومتِ عثمانیہ کی تمام قانونی کتابیں، یورپی قوانین سے متاثر ہوئیں۔ چنانچہ ان کا اکثر حصّہ ترتیب ابواب کے لحاظ سے بھی اور الفاظ و مفہوم کے اعتبار سے

بھی، غیر ملکی قوانین سے ماخوذ تھا۔ حکومتِ عثمانیہ کو یہ تبدیلی تجارتی ضروریات کے لئے اور معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت اختیار کرنی پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کی بعض قانونی کتابیں، جہاں شریعتِ اسلامی کے مطابق ہیں، وہاں بعض کی تفصیلات اسلامی قانون سے ٹکراتی ہیں مثلاً قانونِ تعزیرات نے شریعتِ اسلامی کی بعض سزاؤں، جیسے چور کا ہاتھ کاٹنا، اور کوڑے لگانے کو ختم کر دیا۔ اسی طرح عدالت ہائے دیوانی کے قانونِ اساسی کی دفعہ ۱۱۲ کی رُو سے شریعتِ اسلامی کے سب سے سنگین گناہ اور جرم ربٰو یعنی سود کو جائز قرار دے دیا گیا۔ ؎

مجلۃ الاحکام العدلیۃ تاہم عثمانی حکومت نے زمانے کے نئے تقاضوں کے تحت یہ کوشش بھی جاری رکھی کہ جہاں تک ممکن ہو، اس کے دیوانی قوانین اسلامی شریعت کے مطابق رہیں اور عام عدالتوں میں اس کے مطابق فیصلے ہوں۔ چنانچہ حکومت نے احمد جودت پاشا، جو محکمہ احکامِ عدلیہ کے ناظم تھے، کی قیادت میں علمائے قانون کی ایک مجلس قائم کی۔ ابتداء میں اس مجلس کے سات مندرجہ ذیل علماء رکن بنائے گئے۔

۱۔ جناب احمد خلوصی

۲۔ احمد حلمی ممبر

۳۔ محمد امین جندی

۴۔ سیف الدین ممبر مجلسِ شوریٰ

۵۔ سید خلیل ناظرِ اوقاف

؎

۶۔ شیخ محمد علاؤالدین بن عابدین۔
۷۔ محکمہ احکام عدلیہ کا ایک رکن

دورانِ کار مجلس میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ کچھ اراکین کو بدلا گیا اور کچھ نئے اراکین کا اضافہ کیا گیا۔

مجلس کا مقصد یہ تھا کہ فقہی معاملات کے بارے میں ایک ایسا مجموعۂ قوانین تیار کیا جائے، جو ایک طرف تو باضابطہ ہو اور دوسری طرف سہل المأخذ ہو۔ اختلاف سے پاک ہو، اور ان اقوال پر مشتمل ہو، جن پر فتویٰ دیا گیا ہو اور عام آدمی کے لئے اس کا مطالعہ آسان ہو۔

اس مجلس نے اپنی رپورٹ میں، جو اس نے محرم ۱۲۸۶ھ بمطابق ۱۸۶۹ء کو عثمانی حکومت کے صدرِ اعظم عالی پاشا کی خدمت میں پیش کی تھی۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ کی غرض و غایت یہ بیان کی کہ علم فقہ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے، اس کی باریکیاں سمجھنے اور پیچیدگیاں حل کرنے کے لئے تبحرِ علمی اور مہارتِ تامہ کی ضرورت ہے۔ خصوصاً حنفی مذہب کے بارے میں، کیونکہ حنفی فقہ میں مختلف طبقوں اور درجوں کے بہت سے مجتہد ہوئے ہیں، جن میں باہمی اختلاف کی کثرت ہے۔ اس کے علاوہ فقہ حنفی کے مسائل کی ایسی تنقیح نہیں ہوئی جیسی کہ فقہ شافعی میں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے مسائل ایسے متفرق اور منتشر ہیں کہ ان میں قول صحیح کا پہچاننا اور ان پر مختلف حالات کا چسپاں کرنا، بہت دشوار کام ہے۔ مزید براں زمانہ بدلنے سے معاشرے کے وہ مسائل بھی بدل جاتے ہیں جن کی بنیاد رسم و رواج پر ہوتی ہے۔

یہ قانونی مجلس ۱۲۸۵ھ بمطابق ۱۸۶۹ء میں سال بھر قانون سازی کے کام میں مصروف رہی، اس کے بعد مجلہ کا مقدمہ اور باب اوّل مرتب کر کے شیخ الاسلام

اور حکومت کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کیا۔ اس میں ضروری اصلاحات اور ترمیمات بھی کی گئیں۔ پھر مجلس کے اراکین نے آپس میں کام اس طرح تقسیم کر لیا کہ مجلہ کا الگ الگ حصہ ان کے سپرد ہو گیا۔ مگر صدر مجلس تمام ابواب کی تدوین میں شریک رہا۔ مجلہ کی تالیف ۱۲۹۳ھ بمطابق ۱۸۷۶ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس طرح حکومتِ عثمانیہ کے قانونِ مدنی کی تدوین ہوئی جو سلطان ترکی کے ایک فرمان کے ذریعے مجلۃ الاحکام العدلیۃ کے نام سے شائع کیا گیا۔

مجلہ کے سولہ ابواب مجلۃ الاحکام العدلیۃ ۱۸۵۱ دفعات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک مقدمہ اور سولہ ابواب ہیں، مقدمہ میں سو دفعات ہیں۔ پہلی دفعہ میں علمِ فقہ کی تعریف اور اس کی قسمیں بیان کی گئی ہیں اور باقی دفعات میں عام قواعدِ کلیہ کا بیان ہے۔ مجلہ کے ابواب حسب ذیل معاملات پر مشتمل ہیں۔

۱۔ کتاب البیوع۔ (خرید و فروخت)
۲۔ کتاب الاجارۃ۔ (ٹھیکہ وغیرہ)
۳۔ کتاب الکفالۃ۔ (ضمانت)
۴۔ کتاب الحوالۃ۔ (حوالگی ہنڈی یا چیک وغیرہ)
۵۔ کتاب الرھن۔ (رہن اور گروی رکھنے کے معاملات)
۶۔ کتاب الامانات۔
۷۔ کتاب الھبۃ۔
۸۔ کتاب الغصب والاتلاف۔
۹۔ کتاب الحجر والاکراہ والشفعۃ۔

۱۰۔ کتاب الشرکات۔ (کمپنیاں وغیرہ)

۱۱۔ کتاب الوکالۃ۔

۱۲۔ کتاب الصلح والابراء۔ (مصالحت اور واجبات کی معافی)

۱۳۔ کتاب الاقراء۔

۱۴۔ کتاب الدعویٰ۔

۱۵۔ کتاب البنیات والتحلیف۔

۱۶۔ کتاب القضاء۔

مجلۃ کے اکثر احکام و مسائل، حنفی فقہ کی کتب **ظاہر الروایۃ** یعنی بنیادی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اور جس مسئلہ میں امام اعظمؒ اور صاحبین کا اختلاف ہے۔ وہاں مجلہ میں وہ مسلک اختیار کیا گیا، جو زمانے کے تقاضوں اور مصلحتِ عامہ کے لحاظ سے زیادہ منفعت بخش ہے۔ مثلاً بے وقوف کی بیع کے مسئلہ میں مجلہ نے امام اعظمؒ کی رائے ترک کر کے صاحبین یعنی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کا مسلک اختیار کیا ہے کہ وہ بیع نافذ نہ ہو گی۔ اسی طرح ان چیزوں کی بیع، جن کے تیار کرنے کی فرمائش کارخانہ کو دی جائے۔ ایسی بیع کو **مجلۃ** میں صاحبین کے مسلک کے مطابق جائز قرار دیا گیا ہے۔

مجلۃ میں صرف چند مسائل میں **ظاہر الروایۃ** کو چھوڑ کر دوسری روایتوں کو اختیار کیا گیا ہے۔ جیسے غصب کردہ چیز کے منافع کی ادائیگی کے واجب ہونے میں مجلہ میں حنفی فقہ کے بعد کے فقہاء کی رائے کو ترجیح دی گئی ہے، جو اتفاق سے شافعی فقہ کے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح ابو اللیث

ثمرقندی مؤلف النوازل کے اس قول کو ترجیح دی گئی ہے کہ مالِ منقول میں بیع الوفا جائز ہے۔ جو کہ کتب ظاہر الروایۃ یعنی حنفی فقہ کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔

مجلہ نے عدالتی نظام کے اس خلا کو پُر کر دیا تھا، جو اس زمانے میں پیدا ہو گیا تھا، کیونکہ اس کے ذریعے وہ مسائل شرعیہ، جو فقہ کی مختلف کتابوں میں منتشر تھے، یا ایک ہی مسئلہ کے متعلق متعدد اقوال و فتاوی پائے جاتے تھے، وہ سب واضح اور صریح احکام کی صورت میں اس خوبی سے منضبط ہو گئے کہ عام قانون دان حضرات کو، ان کے سمجھنے اور پیشِ نظر معاملات میں، ان سے استفادہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ ایک نہایت ہی قابلِ قدر کوشش تھی، لیکن چونکہ عثمانی حکومت نے سود جیسی لعنت کو جو قرآنی تعلیمات کے مطابق اللہ اور رسول ؐ سے جنگ کی حیثیت رکھتی تھی، کو جائز قرار دے کر، سرمایہ داری نظام کو سرکاری طور پر اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے زمانۂ جدید میں اسلامی قانون کی تدوین نو کی اس کوشش سے وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے، جن کی اس سے توقع تھی۔

اس دَورِ زوال کا مشہور قاضی

اس دَورِ زوال میں قاضی کا عہدہ ایسا کم وقعت ہو گیا تھا کہ قابل فقہاء اس کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتے تھے، اور جو لوگ اسے قبول کر لیتے تھے، سنجیدہ لوگوں کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت کم ہو جاتی تھی۔ مثلاً اس دور کے ایک قاضی، ابن دقیق العید تھے۔ قاضی بننے سے پہلے ساری اسلامی دنیا میں

ان کے علم وفضل کی دھوم مچی ہوئی تھی، اور ان کا رتبہ امام مالکؒ اور امام ثوریؒ کے برابر قرار دیا جاتا تھا، لیکن جونہی انہوں نے قاضی کا عہدہ قبول کیا، ان کی قدر و منزلت میں کمی آگئی۔ اختصار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس دور سے صرف ایک قاضی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ پچھلے ادوار میں کوشش کی گئی ہے کہ ایسے مشہور قاضیوں کا ذکر کیا جائے، جن کا ہمارے ہاں کچھ نہ کچھ تعارف پہلے ہی سے موجود ہے۔ اسی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے قاضی ابن خلقان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

قاضی ابن خلقان

قاضی ابن خلقان اپنی مشہور کتاب "وفاۃ الاعیان" کی وجہ سے علمی حلقوں میں متعارف ہیں، کیونکہ ان کی اس کتاب سے صرف علماء ہی فائدہ نہیں اٹھاتے، بلکہ مختلف یونیورسٹیوں میں اس کے کچھ حصے داخلِ نصاب بھی ہیں۔ آپ عراق کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے، اور اپنی مذکورۃ الصدر کتاب میں اپنے بارے میں خود لکھتے ہیں "کہ میں ۱۱ ربیع الثانی ۶۰۸ھ کو بمقام اربل پیدا ہوا۔ میرے والد وہاں کے مدرسہ الملک المعظم میں پڑھایا کرتے تھے لیکن میری ولادت کے دو سال بعد، ان کا انتقال ہو گیا، اور میں ۶۲۶ھ میں اربل سے شام کے علاقے حلب میں آگیا اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔

یافعی نے "مراۃ الجنان" نامی کتاب میں بیان کیا ہے کہ خلقان نے ابنِ مکرم سے صحیح بخاری کا درس لیا۔ اور فقہ کا علم موصل میں کمال بن یونس سے حاصل کیا، اس کے علاوہ انہیں شام کے اور بھی کئی اہلِ علم بزرگوں اور فاضلوں سے علم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد علم کے مزید حصول کے لئے مصر تشریف لے گئے۔ ابھی مصر میں تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حکومت کی جانب سے

انہیں شام کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔

اس زوال پذیر دور میں قاضی ابن خلقان کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ اس گئے گزرے دور میں بھی پہلے ادوار کے قاضیوں کی نشانی تھی، انہیں اپنی نوکری سے زیادہ حق بات کہنے کی پرواہ تھی۔ حق کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ اس لئے اس دور میں بھی، جبکہ عام طور پر قاضی بننے کے بعد فقہاء کی قدر و منزلت میں کمی آجاتی تھی۔ آپ عوام میں ہمیشہ کی طرح مقبول رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دس سال تک قاضی کے عہدے پر کام کرنے کے بعد آپ کو اس عہدے سے معزول کر دیا گیا، اور وہ شام سے مصر چلے گئے۔ وہاں بھی انہیں قاضی کا عہدہ پیش کیا گیا، جسے آپ نے قبول کر لیا۔ لیکن شام کے لوگ، آپ کے وہاں سے چلے جانے پر سخت رنجیدہ ہوئے، اور انہوں نے حکومت پر دباؤ ڈال کر، انہیں واپس بلوا کر، قاضی کے عہدے پر دوبارہ بحال کروا دیا۔ مؤلف کتاب "وفاۃ الوفیات" نے لکھا ہے کہ آپ کے شام واپس آجانے پر بہت خوشیاں منائی گئیں، اور کئی شعراء نے آپ کے قصیدے لکھے۔

"شذرات الذہب" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ابن خلقان میں دنیا بھر کی خوبیاں جمع تھیں، وہ بہت بڑے فاضل، فصیح و بلیغ، پاک نفس اور مضبوط ارادے کے مالک تھے۔ امام ذہبی نے ان کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ وہ بہت بڑے عالم، کشادہ رو، خوش طبع، مذہب کے واقف، عربی کے بہت بڑے فاضل، ادب اور شعر کے امام، تاریخ کے ماہر، بہت باخبر، شیریں زبان، سخی اور پاکباز انسان تھے، ان میں ایک بات یہ تھی، کہ کوئی شخص ان کے سامنے کسی دوسرے شخص کی غیبت کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

علامہ اُسنوی نے لکھا ہے کہ خلقان ایک قصبے کا نام تھا۔ اور آپ کے آباء و اجداد وہیں کے رہنے والے تھے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ خلقان، ان کے آباء و اجداد میں سے کسی کا نام تھا، جس کے باعث وہ اس نام سے موسوم ہوگئے۔

آپ کی وفات ۲۷، رجب سنہ ۶۸۱ھ کو مصر کے مدرسہ نجیبیہ میں ہوئی۔ اور انہیں دوسرے روز جبل قیسون کے دامن میں دفن کر دیا گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۳ برس تھی۔ آپ کے بعد کوئی بھی قاضی آپ جیسا علم و فضل نہ رکھتا تھا۔ اس لئے اسلام کے عدالتی نظام کے اس اہم عہدے کی عزّت گھٹ کر رہ گئی۔

دسواں باب

برصغیر ہند و پاکستان میں مسلمانوں کا عدالتی نظام

اس دَور کی سیاسی حالت

مسلمانوں نے اموی دورِ حکومت کے دوران محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ فتح کر لیا۔ اور سندھ ایک عرصے تک اموی اور عباسی خلافت کا ایک مشرقی صوبہ بنا رہا۔ اس لئے اس دَور میں یہاں کا نظامِ حکومت بھی، اموی اور عباسی نظامِ حکومت کی طرز پر تھا۔ دوسرے صوبوں کی طرح اندرونی نظم ونسق کے معاملے میں یہاں کے حکمران مکمل طور پر خود مختار تھے، فتح سندھ سے تقریباً تین صدی بعد غزنوی سلاطین نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی۔ غزنوی نظامِ حکومت کے سلسلے میں سامانیوں کے خوشہ چین تھے، اس لئے ان کی حکومت کا نقشہ اموی اور عباسی خلافتوں سے کچھ مختلف تھا۔ سلاطین اور ان کے درباری ایرانی تزک واحتشام کے دلدادہ تھے، لیکن یہاں آکر انہوں نے سندھ میں پہلے سے قائم شدہ اسلامی حکومت کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا۔

شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں دِلّی پر قبضہ کیا۔ لیکن صحیح معنوں میں سلطنتِ دہلی کی ابتداء ۱۲۰۶ء میں اس وقت ہوئی جب سلطان شہاب الدین محمد غوری کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کے ایک آزاد کردہ غلام قطب الدین ایبک نے یہاں ایک خود مختار حکومت کی بنیاد ڈالی۔ تیرھویں صدی عیسوی کی یہ ترک حکومت مختلف عناصر پر مشتمل تھی۔ جن میں کچھ تو باہر سے آنے والے ترک

تھے اور کچھ یہاں کے ہندوستانی، تیرھویں اور چودھویں صدی میں ان ترک خاندانوں نے برصغیر میں جو شاہی نظام قائم کیا، وہ قدیم ایرانی تصوّر سے کافی حد تک متاثر تھا۔ ایران کے ساسانی بادشاہ اپنے حقوق کو خدا کا عطیہ سمجھتے تھے اور حکمرانی کو اپنے خاندان کا خاص حق سمجھتے تھے۔ یہ وہ دَور ہے جبکہ خود عباسی حکومت کے دَورِ زوال میں انہی اثرات کی جھلک پائی جاتی ہے، اور ان کی روشنی میں جس طرح بادشاہ کو عدالتی کارروائی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا، اسے حنفی فقہ کی معتبر کتاب "ہدایہ" کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے۔ سلاطین دہلی کا ایرانی اور ترکی اثرات کے علاوہ ہندو تصوّرات سے متاثر ہونا بھی ناگزیر تھا۔ اس زمانے میں سلطنتِ دہلی کا اثر و رسوخ زیادہ تر شمالی ہندوستان تک محدود تھا۔ کیونکہ ہندوستان کے عین وسط میں پہاڑوں کے سلسلوں نے جنوبی ہندوستان جسے اس زمانے میں دکن کہا جاتا تھا، کو شمالی ہندوستان سے علیحدہ کر رکھا تھا، اس کے ساحلی علاقوں پر عرب تاجر آتے جاتے رہتے تھے، لیکن انہوں نے یہاں کوئی حکومت قائم نہ کی تھی۔ تیرھویں صدی کے اواخر میں جب سلطنتِ دہلی مضبوط ہو گئی تو مسلمان سلاطین نے دکن کی طرف توجہ دی اور وہاں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔ تاہم مرکز سے دُوری کی وجہ سے یہ علاقہ بہت کم مرکز کے زیرِ اثر رہا، اور یہاں کے والیوں کو جب بھی موقع ملتا، وہ خود مختار ہو جاتے تھے۔

برِصغیر کا عدالتی نظام

ابتدا میں اموی اور عباسی حکومتوں کے ماتحت ہونے کی وجہ سے یہاں کا عدالتی نظام بھی ٹھیک انہی خطوط پر قائم تھا، جیسا کہ اسلامی مملکت کے دوسرے حصّوں میں، یعنی فوجداری مقدمات کے فیصلے سلطان یا اس کے مقرر کردہ والی کرتے، اور

اس کے لئے مسلم یا غیر مسلم ہونے کی کوئی شرط نہ تھی، جب کہ دیوانی مقدمات کے لئے قاضی مقرر تھے۔ اموی دَور میں اسلام کی سادگی اور مساوات کا نظام کسی حد تک باقی تھا، اس لئے اس کی جھلک یہاں پر اس دَور کی حکومت میں بھی نظر آتی ہے۔ فاتح سندھ نے خاص طور پر مذہبی رواداری پر بہت زور دیا، اور مرکز کے فقہاء سے یہ فتویٰ حاصل کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں ہندو مندروں کی حیثیت وہی ہو گی جو اسلامی حکومت کے دیگر صوبوں میں عیسائی کلیساؤں یا یہودی عبادت گاہوں کو حاصل ہے۔ برہمنوں کو وہ تمام حقوق عطا کئے گئے جو ہندو راجاؤں کے زمانے میں انہیں حاصل تھے۔ انہیں ان کے سابقہ انتظامی عہدوں پر بحال رکھا گیا۔ تاہم مسلمانوں کے تنازعات، جو بہت کم ہوتے تھے، شریعتِ اسلامی کے مطابق فیصلے کئے جاتے تھے، جب کہ ہندوؤں کے آپس کے مقدمات، خود ان کے ہندو قانون کے مطابق طے ہوتے تھے۔ ان کے فیصلے ان کی قدیم پنچائتوں کے ذریعے ہی کئے جاتے، جنہیں مسلمان فاتحوں نے جُوں کا توں رہنے دیا، اور ان میں کوئی تبدیلی نہ کی۔

بعد کے آنے والے مسلمان حکمرانوں کے لئے محمد بن قاسم کے یہ انتظامات ایک عمدہ نظیر کی حیثیت رکھتے تھے، اور انہوں نے حتی الوسع ان انتظامات کو اختیار کیا۔ لیکن یہ حکمران عرب کی سادگی سے دُور اور ایرانی شان و شوکت کے دلدادہ تھے، اس لئے اسلامی مساوات، جو اسلام کے ہر قسم کے نظام کے لئے چاہے وہ سیاسی ہو یا عدالتی، کی بنیاد کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ان میں پوری طرح سرایت نہ کر سکی۔ تاہم انہوں نے اس تصور کے مطابق چلنے کی کوشش کی جس کا علمائے وقت نے ان سے مطالبہ کیا، اور وہ یہ کہ ان بادشاہوں کی سب سے بڑی ذمّہ داری یہ ہے کہ وہ شریعتِ اسلامی کے احکامات کی پابندی

کرائیں، اور ان کی خلاف ورزی نہ ہونے دیں۔ ویسے سلاطین دہلی عام طور پر شرعی احکامات کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ چنانچہ قطب الدین ایبک، جو سلطنتِ دہلی کا بانی ہے، اس کے بارے میں خاص طور پر مشہور ہے کہ وہ قاضی فخر الدین کوفی جیسے متبحر عالم کا شاگرد تھا، اور شرعی احکامات کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔

مسلمان سلاطین اور عدالتی نظام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا تھا، تو اس کے بارے میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ اس علیحدگی کا تعلق دیوانی قسم کے مقدمات سے تھا۔ جہاں تک فوجداری جرائم کا تعلق تھا، خلیفہ خود ان کی سماعت کرتا اور خود ہی فیصلے کرتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض اوقات اس سلسلے میں اپنے وقت کے ممتاز علمائے دین سے مشورہ کر لیتا تھا۔ یہی صورتِ حالات مختلف اسلامی ادوار میں رہی۔ پھر جس اصول پر مرکز میں عمل ہوتا تھا، مملکت کے تمام دوسرے علاقوں میں بھی اسی پر عمل کیا جاتا تھا۔ تاہم دُور دراز کے علاقے کہ جن کا تعلق مرکز سے برائے نام ہوتا تھا، جیسا کہ برِّ صغیر ہند و پاکستان تھا۔ وہاں کا عدالتی نظام بھی اسی طریقے کے مطابق منظم کیا گیا تھا، مسلمان بادشاہوں نے ان علاقوں میں نئی نئی حکومتیں قائم کی تھیں۔ ان میں سے بعض اگرچہ بنیادی طور پر مستبد بادشاہ تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے کوشش کی کہ ان کا نظام نہایت ہی عادلانہ ہو۔ انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ اگر ان کے مقرر کردہ قاضی عدل سے کام نہ لیں، تو مظلوم ان تک براہِ راست رسائی حاصل کر سکیں۔

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے سلطان التمش نے انصاف چاہنے والوں

کے لئے اپنے محل کے باہر ایک بڑی سی زنجیر لٹکا رکھی تھی جسے مظلوم ہر وقت استعمال کر کے بادشاہ تک اپنی عرضداشت پیش کر سکتا تھا۔ یہ زنجیر قاضیوں پر ایک قسم کا احتساب کا کام دیتی تھی، اور وہ کسی سے ناانصافی نہیں کرتے تھے، سلطان التمش نے صرف زنجیر لٹکانے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ وہ عدالتی نظام کی جانچ پڑتال کے لئے اکثر دورے بھی کرتا رہتا تھا، اور اس نے ساری مملکت میں یہ اعلان کر رکھا تھا، اور اس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ اگر کسی کے ساتھ ناانصافی ہو تو وہ ان کے علاقے کے دَورے کے دوران سلطان سے مل سکتا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ سلاطین کے درباری ایسے ضرورتمند لوگوں کو سلاطین کے قریب نہیں آنے دیتے۔ عوام کو عدل و انصاف کی ضمانت دینے والے اس بادشاہ سے یہ خرابی مخفی نہ تھی، اس لئے اس کے تدارک کے لئے اس نے یہ حکم دے رکھا تھا، کہ جس کے ساتھ ناانصافی ہو، وہ خاص قسم کا رنگین لباس پہن کر بادشاہ کے سامنے سے گزرے۔ چنانچہ سلطان کی جاری کردہ یہ ہدایات کافی کارگر ثابت ہوئیں اور سلطان ایسے شخص کو دیکھتے ہی اسے فوراً بلا لیتا، اور اس کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہوتی، اس کی فوراً موقعہ پر ہی تلافی کر دیتا۔

اسلامی مرکز میں عدالتی نظام کی کمزوری

عام طور پر برصغیر کا عدالتی نظام، اسلامی مرکز کے نظام کے عین مطابق ہوتا تھا، اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عباسی دَور کے آخر میں وہاں کے عدالتی نظام میں نہ صرف یہ کہ کمزوری کے آثار پیدا ہو چکے تھے، بلکہ اس میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، اور ایسے لوگوں کو قاضی مقرر کیا جانے لگا۔ جن کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کو قاضی مقرر کرنے

کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ دیانت دار قاضی، سلاطین کی خواہشات کی پرواہ کیے بغیر حق و انصاف کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔

تاہم شکر ہے کہ برصغیر کا عدالتی نظام ابھی تک ابتدائی اسلامی دور کے مطابق صحیح بنیادوں پر قائم تھا۔ حالانکہ یہاں کے بادشاہ و سلاطین، ایرانی شان و شوکت کے دلدادہ تھے، اور وہ اپنے درباروں میں اس کا التزام کرتے تھے۔ تاہم ان کی تعداد محدود تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برصغیر کی اراضی، جو اسلامی قانون کے مطابق بیت المال یعنی اسلامی حکومت کی ملکیّت تھی میں اس وقت تک کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ جس کی وجہ سے غیر حاضر زمینداروں کا طبقہ پیدا نہیں ہوا تھا، دوسرے اس دور کے علماء بھی بڑی جرأت سے کام لیتے تھے جس کی وجہ سے اس دور کے حکمران، اپنی خواہشات کو عوام پر مسلط نہیں کر سکتے تھے مثلاً ایرانی اثر و رسوخ کی وجہ سے یہاں کے بعض سلاطین بھی یہ خواہش کرنے لگے کہ جو بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو وہ جھک کر سلام کرے۔ لیکن علمائے وقت نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس دور کی ایک مشہور کتاب "الفتاوی الغیاثیہ" کے حوالے سے اس کی تفصیلات آئندہ سطور میں پیش کی جائیں گی۔

برِّ صغیر کے ابتدائی عدالتی نظام کی بنیادیں

برِّ صغیر ہند و پاکستان میں ابتداء ہی سے جن سلاطین نے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی، وہ سب کے سب امام ابوحنیفہ رح کے فقہی مذہب کے پیروکار تھے۔ اس فقہی مذہب کی بہت سی مستند کتابیں اسلامی دنیا کی مختلف اطراف میں پھیل چکی تھیں۔ لیکن بعض مسائل ایسے تھے کہ جن کا تعلق مقامی حالات سے تھا، اور جن کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ یہاں کے علماء نے یہاں کے حالات کے مطابق اسلامی قانون کی کتابیں مرتب کیں۔

جن میں "الفتاوی الغیاثیہ" سب سے پہلی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ یہ کتاب ساتویں صدی ہجری میں سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں لکھی گئی، اور اسے برصغیر میں اسلامی فقہ پر لکھی جانے والی پہلی کتاب تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب اب بھی مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی اہلِ علم نے اسے طبع کرانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس کے کئی صفحات زمانے کی دستبرد کی نذر ہو گئے ہیں۔ موجودہ مخطوطہ میں ابواب کی جو فہرست دی گئی ہے، ان میں سے کئی ابواب کی تفصیل کتاب میں موجود نہیں۔ اگر فتاوی کا یہ مجموعہ مکمل صورت میں موجود ہوتا، تو برّصغیر کی تاریخ فقہ میں اسے خاص اہمیت حاصل ہوتی۔ تاہم زمانے کی اس دستبرد کے باوجود اس کا فقہی درجہ بڑا بلند ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برّصغیر ہند و پاکستان میں مختلف مسائل کو مقامی حالات کی روشنی میں سمجھنے اور ان کے فیصلے کرنے کا کیا اسلوب تھا اور یہ کہ اس دور میں حکمرانوں اور عوام کو کس قسم کے امور درپیش تھے، اور وہ ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے تھے۔

اس فقہی کتاب میں مسائل کی تفصیلات کو صرف حنفی فقہ تک محدود رکھا گیا ہے۔ اس لئے اس کتاب کے ماخذ بھی حنفی فقہ پر مشتمل ہیں اور تمام مسائل کو اسی فقہ کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ دراصل اس دور میں برصغیر میں صرف حنفی مذہب کی فقہ کے مطابق ہی فیصلے ہوتے تھے، اور اس ملک کے معاشرے کے مسلمان عبادات کے سلسلے میں بھی اسی فقہ کے مسائل پر عمل کرتے تھے۔

فتاوی غیاثیہ کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دیارِ سندھ کے دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہہ علامہ محمد جعفر بن عبد الکریم بوبکانی سندھی نے اپنی مشہور فقہی کتاب "المستانه فی مرمة الخزانه"

میں بے شمار مقامات پر اس فتاوی کا حوالہ دیا ہے، اور متعدد فقہی مسائل اس سے اخذ کئے ہیں۔ المستانہ سندھی ادبی بورڈ کراچی کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتاوی غیاثیہ، ساتویں صدی ہجری میں تصنیف ہوا، اور دسویں صدی ہجری تک کے قاضیوں میں متداول تھا، اور اسی کے مطابق عدالتی فیصلے ہوتے تھے۔ اس اہم کتاب کا جو مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے، وہ چونکہ ناقص ہے، اس لئے بہت سے فقہی مسائل جن کا حوالہ "مستانہ" میں دیا گیا ہے وہ اس میں موجود نہیں۔ [1]

فتاوی غیاثیہ کے بعض اہم مسائل

یہاں کے جو سلاطین ایرانی تہذیب کے اثر کی وجہ سے شان و شوکت کو پسند کرنے لگے تھے، مصنّف نے ان کی طرف خاص دھیان دیا۔ مثلاً" بادشاہ کو سجدہ کرنے کی برائی کے بارے میں مصنّف نے باب الاستحسان والکراھیۃ کی فصل ثالث میں ایک نوع کا عنوان قائم کیا ہے " فی ملاقاۃ الملوک" یعنی بادشاہوں کی ملاقات کے بارے میں"۔ اس میں انہوں نے اس دور کی درباری بدعات اور غیر اسلامی رسوم و عادات کی بڑی جرأت سے برائی بیان کی ہے، اور بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

> " اگر کسی مسلمان کو یہ کہا جائے کہ وہ سلطان کے سامنے سجدہ کرے، ورنہ قتل کر دیا جائے گا، تو افضلیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سجدہ نہ کرے۔ کیونکہ یہ کفر ہے۔ اور افضل یہ ہے کہ کفر

---

[1] ماہنامہ "المعارف" لاہور بابت جولائی ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۰

سے احتراز کیا جائے ۔ اگر اس کے لئے کسی مسلمان کو کتنا ہی مجبور کیوں نہ کیا جائے ۔"

تعظیم سے ہاتھ چومنا تاہم وہ عادل سلطان کا ہاتھ چومنا جائز قرار دیتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :۔

"تقبیل ید العالم والسلطان العادل جائز"

(ترجمہ) عالمِ دین اور عادل سلطان کا ہاتھ احتراماً چومنا جائز ہے ۔

اسی باب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر امیر کسی کو اپنے ہاں طلب کرے اور اس انداز کی بات کرے کہ اس کا صحیح جواب دینے کی صورت میں سزا اور عقوبت کا خطرہ لاحق ہو ، تو کیا کرنا چاہیئے ۔؟ تو فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ خلافِ حق کوئی بات زبان سے نہ نکالی جائے اور اس امر کی شریعتِ اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں کہ وہ سلطان کو خوش کرنے کے لئے اس کی مرضی کی بات کرے ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص ظالم کے پاس اس کی مرضی کے مطابق ناحق اور غلط بات کہتا ہے ، تو اللہ تعالیٰ بطورِ سزا کے ظالم کے دل کو اس کی طرف سے بدل دے گا اور اسے اس پر مسلط کر دے گا ۔ [۲]

سلاطین کی خدمت میں حاضری سلاطین وملوک کے درباروں میں حاضری دینے کے سلسلے میں امام ابو اللیث کے حوالے سے لکھتے ہیں :۔

عن ابی اللیث الحافظ انہ یکرہ الدخول علی

---

[۲] ایضاً صفحہ ۵۰

السلاطین ویفتی بذلک[۳]

(ترجمہ) امام ابو اللیث سلاطین کے ہاں جانے کو بُرا سمجھتے تھے،
اور یہی فتوے دیتے تھے۔

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی مرکزی سیاسی طاقت کی کمزوری کے باوجود دور دراز کی مسلمان حکومتوں میں ابھی تک علماء کو حق بات کہنے کی جرأت تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ مسلمان برصغیر میں ابھی تازہ تازہ وارد ہوئے تھے اور ان میں اسلامی احکامات پر عمل کرنے کا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔

عدالتی نظام قاضی القضاۃ کے ماتحت تھا

برّصغیر ہند وپاکستان کے جس اسلامی دَور کی بات کی جا رہی ہے، اس دَور میں مرکزی اسلامی حکومت یعنی بغداد میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قائم ہو چکا تھا۔ اس کی افادیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے دُور دراز کی اسلامی مملکتوں نے بھی اسے اختیار کر لیا تھا، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، مسلمانوں نے یہ عہدہ، ایران کے عدالتی نظام کے سربراہ موبد موبذان کی طرز پر قائم کیا تھا۔ برّصغیر کے مسلمان بادشاہ تو ویسے ہی ایران کے سامانی بادشاہوں سے متاثر تھے۔ اس لئے یہاں قاضی القضاۃ کے عہدے کو، اس کے پورے لوازمات کے ساتھ اپنا لیا تھا۔ اس کے پاس خلافتِ بغداد کے قاضی القضاۃ سے بھی زیادہ اختیارات ہوتے تھے۔ چنانچہ اس عہدے کے لئے غیر معمولی قابلیّت کے اہلِ علم، جو اسلامی فقہ کے ماہر ہوتے تھے، کو منتخب کیا جاتا تھا۔ سلاطین اپنے آپ کو اسلام کا خادم ظاہر

---

[۳] (مخطوطہ ورق ۷۹)

کرنے کے لئے، ہمیشہ یہ کوشش کرتے کہ عامتہ الناس سے اسلام کے ظاہری احکامات کی پابندی کرائیں۔ اس مقصد کے لئے وہ عدلیہ پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اس کو زیادہ فعال بنانے کے لئے انہوں نے عدلیہ میں کچھ نئے عہدوں کا بھی اضافہ کر دیا تھا، جن کے ذمّے ایسے فرائض سونپے گئے جنہیں آج کل پولیس کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً قاضی القضاۃ کو مشورہ دینے کے لئے جہاں مسلمان مفتی اور ہندو پنڈت موجود ہوتے تھے، وہاں لوگوں کو اسلامی اخلاق پر عمل کرنے کے لئے سرکاری اہلِ کار مقرر کئے جاتے تھے۔ مفتی مسلمان فریقین کے تنازعات کے سلسلے میں شرعی احکامات کی وضاحت کے سلسلے میں قاضی القضاۃ کی مدد کرتے تھے، جب کہ ہندو پنڈت ایسے ہی مقاصد کے لئے ہندو فریقین کے تنازعات کے فیصلے میں مددگار ہوتے تھے۔ قاضی القضاۃ کے مددگاروں میں کوتوال، جسے بعض علاقوں میں محتسب کا نام دیا جاتا تھا، زیادہ اہمیت کا حامل تھا، کیونکہ اس کی ذمہ داریاں متنوع قسم کی تھیں۔ وہ قاضی القضاۃ کے فیصلوں کی پابندی کراتا۔ قانون کی عام پابندی کراتے ہوئے وہ کمزوروں کو ظالموں سے بچانے کی کوشش کرتا۔ عامتہ النّاس کی اخلاقی حالت پر نگاہ رکھنا۔ نشہ آور اشیاء مثلاً شراب وغیرہ کی فروخت پر پابندی کے حکم پر عمل کراتا۔ چنانچہ اگر وہ کسی شخص کو نشے کی حالت میں پاتا، تو اسے فوراً گرفتار کرنے کا حکم دیتا۔ ناپ تول کے نظام پر کڑی نگاہ رکھتا۔ مختلف مساجد کے دورے کر کے یہ معلوم کرتا کہ محلے کی آبادی کے لحاظ سے وہاں کتنے لوگ نماز ادا کرنے کے لئے آتے ہیں۔

چونکہ اس عہدے کا تعلق زیادہ تر دینی امور سے تھا۔ اس لئے بعض علاقوں میں اسے اسلامی کوتوال کا نام دیا جاتا تھا۔

داد بک

قاضی القضاۃ کی مدد کے لئے ایک اور عہدیدار "داد بک" بھی ہوتا تھا۔ یہ عہدے دار مملکت کے مختلف صوبوں میں متعین تھے۔ جو قاضی القضاۃ اور عام قاضیوں کے انتظامی مددگار ہوتے تھے۔ داد بک کے فرائض یہ تھے کہ وہ ہر اس شخص کو، جس کے نام قاضیوں کی عدالتوں سے طلبی کے سمن جاری ہوں۔ وہ ان کی تعمیل کرائیں۔ اور انہیں عدالت میں حاضر کریں۔ اس کے علاوہ بھی اگر وہ محسوس کرتے، تو ہر ایک "داد بک" کو اس کی ضرورت کے مطابق زائد فرائض سونپ دیئے جاتے۔ ؎۴

صدرِ جہان کا عہدہ

برّصغیر میں مروّج عدالتی نظام کم و بیش اسلامی دنیا کی مرکزی خلافت کے عین مطابق تھا۔ تاہم مختلف اسلامی علاقوں میں خاص طور پر، جو مرکز سے بہت دُور دراز فاصلے پر واقع تھے؛ ان میں وہاں کے حالات کے تقاضوں کے مطابق کچھ رد و بدل بھی کر لیا جاتا تھا۔ مثلاً برّصغیر میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قائم ہوئے نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ یہاں اس سے بھی ایک بلند عہدہ قائم کیا گیا، جسے صدرِ کل یا صدرِ جہان کہتے تھے۔ یہ عہدہ سلطان ناصر الدّین نے قائم کیا تھا، وہ کسی معاملے میں اپنے قاضی القضاۃ منہاج السراج سے خوش ہوئے، تو اس کا مرتبہ بلند کرنے کے لئے یہ عہدہ قائم کر دیا۔ اس کی تائید اس امر سے ہوتی ہے، کہ انہوں نے یہ عہدہ اپنے قاضی القضاۃ کو ہی منتقل کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں برّصغیر میں صدرِ جہان، محکمہ عدلیہ کا صدر

؎۴ تاریخ فیروز شاہی مطبوعہ کلکتہ۔ از ضیاء الدین برنی۔ صفحہ ۴۴۱

سمجھا جانے لگا۔ [۵]

بعد میں صدرِ جہان کے فرائض میں یہ اضافہ کیا گیا کہ وہ بادشاہ کی غیر حاضری میں فوجداری مقدمات کی سماعت کرتا۔ مختلف شہروں کے قاضیوں کا تقرر پہلے ہی قاضی القضاۃ کے مشورے ہی سے ہوتا تھا۔ اب تقرری کے احکامات صدرِ جہان کے دفتر سے جاری ہونے لگے۔ پہلے شرعی معاملات میں قاضی القضاۃ سے صرف مشورہ کیا جاتا تھا۔ اب صدر جہان کو خود ان امور کے فیصلے کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ کیونکہ وہ عدالتی نظام کے علاوہ مذہبی امور کے محکمے کا انچارج بھی تھا۔ ان دنوں تعلیم کا شعبہ بھی صدرِ جہان کی نگرانی میں کام کرتا اور اہلِ علم اور اچھی کارکردگی والے اشخاص کو خطاب سے نوازتا۔ مختصر یہ کہ بّرِصغیر کے اسلامی دَور میں یہ عہدہ کافی اہمیّت کا حامل تھا اور سلطان اور اس کے وزیرِ اعظم کے بعد ملک میں یہ تیسرا بڑا عہدہ ہوتا تھا۔

سلطان ناصر الدّین نے ۱۲۴۸ھ میں منہاج السراج کو اس عہدے پر تعیّنات کیا تھا۔ جس سے ان کا پہلا عہدہ یعنی قاضی القضاۃ کا عہدہ خالی ہو گیا تھا۔ اس پر ایک دوسرے قاضی ضیاء الدّین کو فائز کر دیا گیا تھا، جو اس سے پہلے محکمہ عدلیہ کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ بعد میں سلطان علاؤ الدّین خلجی نے قاضی صدر الدّین عارف کی ذات میں یہ دونوں عہدے اکٹھے کر دیئے تھے۔ پھر سلطان فیروز تغلق نے عارضی طور پر ان دونوں عہدوں کو الگ کر دیا تھا۔ بعد میں برِّ صغیر کے عدالتی نظام میں یہ دونوں عہدے یعنی صدرِ جہان اور قاضی القضاۃ ایک ہی شخص کے پاس رہے۔

---

[۵] ایضاً

وزیرِ داخلہ یا امیر داد

اسلامی مرکز اور دوسرے اسلامی ملکوں کے برعکس برّ صغیر ہند و پاکستان کے عدالتی نظام میں ایک مزید عہدے کا ذکر ملتا ہے۔ جس کا نام امیر داد تھا، جو اپنے فرائض کے لحاظ سے موجودہ دَور کے وزیرِ قانون سے ملتا جلتا تھا۔ امیر داد، سلطان کی عدم موجودگی میں فوجداری عدالت کی صدارت کرتا تھا۔ لیکن جب سلطان موجود ہوتا، تو اس کی حیثیت ایک مددگار سے زیادہ نہ ہوتی، جو عدالتی انتظامات کے سلسلے میں مختلف امور سر انجام دیتا۔ چونکہ یہ عہدہ بڑا اہم ہوتا تھا، اس لئے امیر داد، اچھے کردار اور اچھی قابلیت کے لوگ ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ بھی تمام سرکاری ملازمین سے زیادہ ہوتی تھی، اور یہ فوج کے سپہ سالاروں اور صوبوں کے گورنروں کے خلاف لوگوں کی شکایات سننے کے مجاز تھے۔ صوبوں اور فوجوں میں امیر داد کے نائب کام کرتے تھے۔ اس عہدے کی ایک بڑی ذمّہ داری یہ بھی تھی کہ قاضیوں کے فیصلوں پر عمل کرائے۔ قاضی مقدمات میں جو سزا سناتے تھے۔ ان کا نفاذ بھی امیر داد کی ہی ذمّہ داری تھی۔ [۵]

اس کے علاوہ اگر قاضی کے فیصلے میں کوئی غلطی سامنے آتی تو وہ قاضی کو اس طرف متوجّہ کر کے اس کی اصلاح کرا لیتا، اور اگر کوئی فریق قاضی کے فیصلے کے خلاف قاضی القضاۃ یا بادشاہ کے پاس نظرِثانی کے لئے اپیل کرتا، تو اس اپیل کے فیصلہ تک امیر داد قاضی کے فیصلے پر عمل درآمد ہونے کو ملتوی کرا دیتا۔ پولیس، کوتوال وغیرہم سب اس کے ماتحت ہوتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عہدہ موجودہ دَور کے وزیرِ داخلہ کے متماثل تھا۔ قاضیوں کے فیصلوں کا

---

[۵] ایضاً صفحہ ۳۵۸

ریکارڈ بھی اسی امیر داد کے دفتر میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ چونکہ عدالتی نظام کی ذمہ داری سلطان پر عائد ہوتی تھی۔ اس لئے وہ حالات کے مطابق عدالتی نظام میں ردّو بدل کرتا رہتا تھا۔ تاہم اس کا عام ڈھانچہ وہی تھا، جو اس کے مطابق اسلامی مرکز میں عدالتی امور سرانجام پاتے تھے۔ یعنی :-

۱۔ فوجداری مقدمات کا فیصلہ سلطان خود کرتا تھا۔

۲۔ قاضی عام طور پر صرف دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔

۳۔ عدالتی نظام کی ترقی کے ساتھ قاضی القضاۃ کا عہدہ وجود میں آیا۔

۴۔ قاضی القضاۃ مملکت کے عدالتی نظام کو کنٹرول کرتا تھا۔

۵۔ پہلے سلاطین ہی قاضیوں کا تقرر کرتے تھے۔ ان کی سیاسی طاقت کمزور ہوئی، تو ان کا تقرر بھی قاضی القضاۃ ہی کرنے لگے۔

۶۔ مختلف اسلامی ممالک کے حالات کے مطابق عدلیہ میں کچھ مزید عہدے قائم ہوئے جیسا کہ برصغیر ہند و پاکستان میں صدرِ جہان اور امیر داد کے عہدے۔ وغیرہ۔

گیارھواں باب

برِّصغیر میں اسلامی عدالتی نظام کی بنیادیں

دَورِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے عدالتی نظام کے بارے میں بیان کیا جاچکا ہے، کہ ہر قسم کے تنازعات و مقدمات کے فیصلے قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں ہوتے تھے۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں قرآن حکیم سے راہنمائی نہ مل سکتی تو پھر احادیثِ نبویؐ کے مطابق عمل کیا جاتا۔ تاہم اس کی ضرورت شاذ و نادر ہی ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ خلفائے راشدین اور خاص کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احادیثِ مبارکہ کو جمع کرنے کی سخت حوصلہ شکنی کی۔ اموی دَور میں بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔ لیکن جب عباسی دَور میں فقہ کی تدوین ہوگئی تو عدالتی فیصلوں میں قرآن و حدیث سے براہِ راست حکم معلوم کرنے کی بجائے فقہ اسلامی کی مدوّن کتابوں کو کافی سمجھ لیا گیا۔ عباسی دَور کے زوال کے بعد تو حالت اور ہی خراب ہوگئی تھی۔ اور مشہور حنفی امام علامہ کرخی رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے سے بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن و حدیث کے مقابلے میں عملاً فقہ کو ترجیح دی جانے لگی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر فقہ کا کوئی مسئلہ قرآن یا حدیث کے احکامات سے ٹکراتا، تو اس غلط فقہی مسئلہ کو ترک کرنے کی بجائے قرآن و حدیث کے احکامات کی تاویل کرلی جاتی۔ اور اگر کوئی تاویل مکمل نہ ہوتی تو بڑی بے خوفی سے یہ اعلان کر دیا جاتا کہ قرآن کی یہ آیت یا حدیث منسوخ ہے۔ [1]

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی ترجمہ اردو صفحہ ۴۲۱

اتفاق سے برّصغیر ہند و پاکستان میں، اسی زمانے میں اسلام کو عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ مسلمان سلاطین نے حتی المقدور اسلام کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب علمائے کرام ہی قرآن و حدیث سے دُور ہوتے گئے، تو سلاطین اس بارے میں کیا کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی قاضی حضرات اپنے عدالتی فیصلوں کے لئے مختلف فقہی فتاویٰ سے ہی راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے بعض فتاویٰ ایسے ہیں کہ آپ ان کے سینکڑوں صفحات پڑھ جائیں، لیکن کہیں قرآن مجید کی تعلیمات کا حوالہ نہ ملے گا۔ البتہ عبادات کے احکامات و مسائل کے بیان میں کہیں کہیں تبرکاً آیات نقل کردی گئی ہیں۔ پھر مقامی حالات کے تقاضوں کے مطابق خود برّصغیر ہند و پاکستان میں فتاوی کے کئی مجموعے تیار ہوئے جن میں سے فتاوی غیاثیہ کا تعارف سابقہ صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے۔ یہ تمام فتاوی چونکہ اپنی مخصوص علیحدہ حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے قاضی حضرات کو پیچیدہ قسم کے مقدمات کے فیصلوں کے لئے ان میں سے اکثر کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا، جس کی وجہ سے بعض اوقات انہیں فیصلہ کرنے میں دیر لگتی۔ چنانچہ یہاں کے ایک عالم دین بادشاہ، سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے اس خامی کو محسوس کیا، اور علماء کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت تک لکھی ہوئی حنفی فقہ کی تمام کتابوں کو سامنے رکھ کر فتاوی کا ایسا مجموعہ تیار کیا جائے کہ جو قاضیوں کو فقہِ اسلامی کی ڈھیروں کتابوں کا مطالعہ کرنے سے بے نیاز کردے۔

فتاویٰ عالمگیری

اس فتاویٰ کو مدوّن کرانے والے بادشاہ یعنی سلطان اورنگ زیب عالمگیر، خود بھی ایک بہت بڑے عالمِ دین تھے۔ اور علمائے وقت کی طرح بہت سے علوم و فنون پر دسترس رکھتے

تھے۔ وہ احکامِ شریعت کی بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود بھی غیر شرعی لباس سے اجتناب کرتے تھے اور اس سلسلے میں اپنے وزراء اور امراء پر بھی پابندی لگادی تھی۔ برِّصغیر ہند و پاکستان میں اورنگ زیب عالمگیر غالباً پہلا مسلمان بادشاہ تھا کہ جس کے دربار میں ایرانی شان و شوکت نہیں تھی۔ وہ علمائے دین سے خاص ربط و علاقہ رکھتا تھا اور ہفتے میں تین دن علامہ سیّد محمد الحسینی قنوجی، علامہ محمد شفیع یزدی، شیخ نظام الدّین برہان پوری اور دیگر علمائے کرام سے امام غزالی کی مشہور کتاب "احیاء علوم الدین" "کیمیائے سعادت" اور "فتاویٰ عالمگیری" پر مذاکرہ اور مباحثہ کرتا تھا۔ سلطان ہمیشہ علومِ دین کی ترویج و اشاعت میں کوشاں رہتا تھا۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے چالیس سال کی عمر میں ۱۰۶۸ھ میں برِصغیر ہند و پاکستان کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ تخت نشینی کے آٹھ دس سال بعد آپ نے یہ فتاویٰ مرتب کروانے کا انتظام کیا۔ جو اس زمانے میں دو لاکھ روپے کے خرچ سے دو سال میں تیار ہوا۔ اس کا نام "الفتاوی الہندیہ" رکھا گیا۔ عرب ممالک میں اب بھی یہ اسی نام سے مشہور ہے۔ لیکن برِصغیر میں سلطان کی نسبت سے یہ فتاویٰ عالمگیری کے نام سے ہی معروف ہے۔ اس اہم منصوبے کو کامیابی سے سرانجام دینے کے لئے سلطان نے اس کے اہتمام و انصرام کی ساری ذمّہ داری شیخ نظام الدّین برہان پوری پر ڈالی۔ انہیں کے مشورے سے اس عظیم کام کو سرانجام دینے کے لئے علمائے دین کی ایک جماعت کا انتخاب کیا گیا۔ ان علماء کی تعداد پوری پانچ صد تھی۔ [۲]

---

[۲] فتاویٰ عالمگیری اردو۔ جلد اوّل دیباچہ صفحہ ۲۴۳

علماء و فضلاء کی یہ جماعت بڑی تندہی سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں لگ گئی۔ ان تمام علماء کے لئے سرکاری خزانے سے معقول وظائف اور مناسب عطیات کا اہتمام کر دیا گیا تھا۔ شیخ نظام الدین برہان پوری نے فتاویٰ کی تالیف کے کام کو چار حصّوں میں منقسم کر کے اس دور کے چار بڑے بڑے فقہاء کے سپرد ایک ایک حصّہ کر دیا۔ پہلا حصّہ قاضی محمد حسین جونپوری، دوسرا حصّہ سیّد علی اکبر اسعد اللہ خانی، تیسرا حصّہ شیخ حامد جونپوری، اور چوتھا حصّہ مفتی محمد اکرم لاہوری کے سپرد کیا گیا۔ ان چاروں حضرات کی نگرانی میں پانچسو علماء نے پورے دو سال کی محنت سے اس فتاویٰ کو مرتب کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اصل فتاویٰ عربی زبان میں ہے اور چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مضامین اور مندرجات کے اعتبار سے یہ فقہ کی نہایت ہی مفصل کتاب ہے جو مختلف اوقات میں مختلف سائزوں پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوتی رہی ہے۔ قاہرہ سے بھی اس کا ایک ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ جس کا فوٹو ایڈیشن آج کل پاکستان میں عام دستیاب ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ مولانا سیّد امیر علی صاحب نے کیا، جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس ترجمے کا اہتمام مطبع نولکشور لکھنؤ نے کیا تھا۔ اور اب لاہور سے بھی دو تین ناشروں نے اسے شائع کیا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں اس امر کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ فقہی مسائل کے ہر باب جسے اصطلاح میں کتاب کہتے ہیں، کی ابتداء میں اس فقہی مسئلہ کے معانی و مطالب کی وضاحت کر دی گئی ہے مثلاً "کتاب الحوالہ، کتاب الشہادات یا کتاب الوکالۃ وغیرہ سب کے آغاز میں متعلقہ مسئلہ کی تعریف بیان کر دی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اسلامی قانون میں حوالہ کے کیا معنی ہیں، شہادت یعنی

گواہی کا کیا مطلب ہے اور وکالت کیسے کہتے ہیں۔

یہ فتاویٰ اگرچہ حنفی فقہ کی امہات کتب میں شمار ہوتا ہے لیکن اس فقہی مذہب کے دوسرے مجموعہ فتاویٰ کی طرح اس میں بھی حنفی فقہ کے بانی حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اصل فتاویٰ بہت کم نقل کئے گئے ہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہؒ ہر قسم کے اوقاف کو شرعاً ناجائز قرار دیتے تھے۔ اور اس کے عدم جواز کے لئے انہوں نے سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۰۳ پیش کی۔ لیکن فتاویٰ عالمگیری جیسی مستند کتاب میں امام صاحبؒ کے اس فتویٰ کا کہیں ذکر تک نہیں، بلکہ اس میں اور حنفی فقہ کی دوسری معتبر کتابوں میں اوقاف کے مسائل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ شاید وہ کوئی اسلامی ادارہ ہے۔

اسلامی قانون کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ لیکن فتاویٰ عالمگیری میں اکثر مسائل کے بارے میں قرآن حکیم کی تعلیمات کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ اوقاف کے سلسلے میں ابھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اس فتاویٰ کے سینکڑوں صفحات الٹ جائیے، کہیں قرآن حکیم کا ذکر تک موجود نہیں۔ امام صاحبؒ کے بعض ایسے مسائل نقل کیے گئے ہیں، جو قرآن و سنت کے عین مطابق ہیں۔ لیکن فتویٰ ان کے خلاف دیا گیا ہے مثلاً عہدہ قضا کے بارے میں امام صاحبؒ کے خیالات ان الفاظ میں پیش کیے گئے ہیں:۔

"امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو قضا کرنے کی تکلیف دی گئی۔ انہوں نے انکار کیا، تو ظالم حکمران نے آپ کو نوّے کوڑوں کی سزا دی۔ پھر جب انہیں اپنی جان کا خوف ہوا تو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ پس قاضی ابویوسفؒ نے ان کے لئے قضا کا عہدہ

قبول کرنا تجویز کیا۔ اور کہا کہ اگر آپ قبول کر لیتے، تو لوگوں کو بہت نفع پہنچاتے۔ امام اعظمؒ نے جواب دیا کہ اگر تم مجھے سمندر پار جانے کو کہتے تو میں اپنے میں اس کام کرنے سے زیادہ قوت و قدرت پاتا۔ اور میں تجھ کو دیکھتا ہوں کہ تو قاضی ہو گیا ہے۔ پھر سر نیچا کر لیا اور ان کی طرف کبھی نہ دیکھا۔ یہ تفصیلات خزانۃ المتقین میں ہیں۔ ؎۳

حنفی فقہ کے بانی کے الفاظِ ناراضگی ملاحظہ ہوں۔ در اصل امام صاحب کسی صورت میں ملوکیت کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار نہ تھے۔ اسی لئے انہیں امام ابو یوسفؒ کے مشورہ سے سخت دکھ پہنچا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد، ان کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ فرمایا۔ لیکن امام ابو یوسفؒ پر اپنے امام کی ناراضگی کا اثر نہ ہوا، اور انہوں نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔ حیرت کی بات ہے کہ حنفی فقہ کے بانی کی اس ناراضگی کے باوجود فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین نے اکثر مسائل میں امام اعظم صاحبؒ کے مقابلے میں امام یوسفؒ کے فتاویٰ کو ترجیح دی ہے۔

اس دور کے مشہور قاضی

قاضی نصیر الدّین برہان پوری

قاضی نصیر الدّین بن قاضی سراج محمد حنفی برہان پوری فقہ، حدیث اور

؎۳ اردو ترجمہ فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم صفحہ ۱۲۱

علومِ عربیہ کے ممتاز عالم تھے۔ ان کے زمانے میں کوئی دوسرا عالم رجال و حدیث کے علم میں ان پر فوقیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ کتاب و سنت پر عمل کرنے والے، صادق القول، خوش اخلاق اور بلند کردار کے مالک تھے۔ اپنے والد قاضی سراج محمد اور شیخ عثمان بن عیسیٰ سندھی سے علومِ متداولہ کی تحصیل کی۔ اور طویل عرصے تک اپنے شیخ عثمان سے منسلک رہے۔ یہانتک کہ علوم میں اس درجہ پختگی اور گہرائی حاصل کی کہ تمام معاصرین پر فوقیت لے گئے۔ ان کے علم کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف اٹھارہ سال کی عمر میں ایک مرتبہ ایک علمی بحث میں علامہ شکر اللہ شیرازی کو خاموش کر دیا تھا۔

قاضی نصیر الدین اہلِ علم کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو حدیث کو قیاسِ مجتہد پر ترجیح دیتے تھے۔ یہانتک کہ وہ ارشادِ رسول ؐ کے مقابلے میں کسی قیاس کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے۔ کہ حدیث علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل [۴] جھوٹی ہے۔ اسی بناء پر ان کے خسر شیخ علم اللہ بیجاپوری نے انہیں کافر قرار دے دیا تھا۔ اور انہیں قتل کر دینے اور آگ میں جلا دینے کا فتویٰ جاری کر دیا تھا۔ اس فتویٰ پر عملدرآمد کرانے کی غرض سے شیخ علم اللہ بیجاپوری صاحب نے ایک محضر نامہ تیار کیا، جس پر اپنے وقت کے تمام مشہور علماء سے مہریں ثبت کرائیں۔ صرف شیخ فضل اللہ برہان پوری اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی نے اس محضر نامے کی تصویب و تصدیق کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر عبدالرحیم بن بیرم خان

---

[۴] میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

جو تاریخ میں خانِ خاناں کے نام سے مشہور ہیں، نے قاضی نصیر الدین کی مدد کی، اور فتوے پر عمل نہ ہونے دیا۔

فتوے کی تصدیق کرنے والے علماء نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا، اور سارا معاملہ شاہِ ہند جہانگیر کے سامنے پیش کیا۔ سلطان نے فتویٰ سے اختلاف کرنے والے دونوں شیوخ یعنی شیخ فضل اللہ برہان پوری اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم جاری کیا۔ لیکن اسی دوران شیخ علم اللہ بیجاپور سے چلے گئے؛ اور ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری سے وابستگی اختیار کر لی۔ خود قاضی نصیر الدین صاحب نے مخالفت کا زور کم کرنے کے لئے سفرِ حجاز کا ارادہ کیا۔ عبد الرحیم خانِ خاناں نے ان کے لئے سامانِ سفر مہیّا کیا، اور سفری سہولتیں بہم پہنچائیں۔ قاضی صاحب حرمین شریفین میں پانچ سال مقیم رہنے کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ واپسی پر انگریزوں کی گرفت میں آ گئے اور کچھ عرصہ تک ان کی قید میں رہے، اور بعد ازاں انہیں رہا کر دیا گیا۔ اور وہ ۱۰۲۴ھ میں بندرگاہ داشل میں داخل ہوئے، جو سلطان عادل شاہ کی زیرِ نگین تھی۔ عادل شاہ نے بندرگاہ سے تین میل کی مسافت پر ان کا استقبال کیا، اور انہیں دار الامارت میں ٹھہرایا۔

جب جہانگیر بادشاہ نے حجاز سے آپ کی واپسی کی خبر سنی، تو آپ کو اپنے دار الحکومت میں تشریف لانے کی دعوت دی، اور تاکید کی کہ ضرور قدم رنجہ فرمائیں۔ لیکن وہ برہان پور آ کر اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اور فیصلہ کیا کہ وہ گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلیں گے۔ جہانگیر نے اپنے بیٹے خرم یعنی سلطان شاہجہان کو انہیں لانے کے لئے برہان پور بھیجا۔ جو انہیں وہاں سے بادشاہ سے ملاقات کے لئے آگرے لے گیا۔ جہانگیر نے آپ کا بے حد احترام کیا، اور

طویل عرصے تک انہیں اپنی صحبت میں رکھا اور پھر آخری عمر میں انہیں برہانپور واپس جانے کی اجازت دے دی۔ وہاں آکر وہ گوشہ نشین ہو گئے، جہاں ۱۰۲۱ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ ؎۵

تذکرۂ علمائے ہند میں الفاظ کی کمی بیشی سے یہی حالات مرقوم ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ قاضی نصیر الدین برہان پوری نے حرمین شریفین اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے فارغ ہو کر پانچ سال کے بعد وطن کا قصد کیا، تو ان کا جہاز فرنگیوں کے تسلط میں آ گیا۔ فرنگیوں سے آپ کی گفتگو ہوئی، تو وہ آپ کے علمی کمالات سُن کر بڑے متاثر ہوئے، اور اپنے حاکم کے پاس لے گئے۔ لیکن قاضی نصیر الدّین وہ آداب نہ بجا لائے جن کا ان کے حاکم کے سامنے بجا لانا ضروری تھا۔ ان لوگوں نے آداب بجا نہ لانیکی وجہ پوچھی تو فرمایا "جو آداب تم نے اپنے ذمّے ضروری قرار دے رکھے ہیں، ہم ان کی پابندی نہیں کر سکتے۔"

آگے چل کر لکھا ہے کہ بادشاہ جہانگیر نے ان کی باتیں سنیں تو فرمانِ طلبی بھیجا اور حکیم خوشحال ولد حکیم ہمام کو تاکید کی کہ انہیں ہر حالت میں روانہ کر دیا جائے۔ وہ بیجا پور اپنے وطن برہان پور پہنچے اور گھر سے نہ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے میں شہزادہ شاہجہان دکن کی صوبہ داری پر مامور تھا۔ وہ برہان پور آیا، اور قاضی نصیر الدین کو طلب کیا۔ پہلے تو انہوں نے حاضری سے احتراز کیا۔ آخر شہزادہ شاہجہان کے پاس آئے، لیکن آدابِ شاہی نہ بجا لائے۔ مگر شہزادے نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بلکہ کہا کہ قاضی صاحب ہم آپ سے ملنے کے لئے بہت بیتاب تھے۔ اور آپ کی زیارت کے از حد مشتاق۔ قاضی صاحب

؎۵ نزہتہ الخواطر جلد پنجم (اردو ترجمہ) صفحات ۴۱۷، ۴۱۸

نے کہا "کس لئے ۔؟" جواب دیا: "آپ کے علمی کمالات سن کر" تو اس پر قاضی صاحب نے فرمایا کہ "اب مجھ میں وہ کیفیت نہیں رہی ۔ [۶]

قاضی نصیر الدین شیخ نظام الدین برہان پوری کے استاد تھے ۔ انہوں نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے سلسلے میں مفید مشورے دیئے ۔ تاہم یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اس کی تدوین کے کام میں شریک بھی تھے یا نہیں ۔ لیکن اگر وہ شریک ہوتے تو فتاویٰ عالمگیری کی شکل وصورت کچھ اور ہوتی ۔ کیونکہ وہ روایتی قسم کے مولوی نہیں تھے ، بلکہ اپنے زمانے کے لحاظ سے کافی روشن خیال تھے ۔ افسوس ہے کہ اس زمانے میں عدالتوں میں جو فیصلے کئے جاتے تھے ، ان کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ۔ ورنہ جیسا کہ قاضی صاحب کو ان کی روشن خیالی کی وجہ سے گردن زنی کے قابل قرار دے دیا گیا ۔ ان کے فیصلوں میں ان کی روشن خیالی کی جھلک نظر آتی ۔

---

[۶] تذکرہ علمائے ہند (فارسی) صفحہ ۲۳۸-۲۳۹

بارھواں باب

یورپ کی محکومی میں مسلمان ممالک کا عدالتی نظام

اس دَور کی سیاسی حالت

اس دَور کی ابتداء ۹۴۲ھ سے ہوتی ہے۔ جب پرتگالیوں نے ساحل ہند پر اپنی بستیاں بسا کر، وہاں کے مقامی باشندوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ مسلمانوں کے اس دَورِ زوال میں صرف ترکی کی عثمانی حکومت ہی ان کا واحد دنیاوی سہارا تھی۔ چنانچہ علاقہ گجرات کے سلطان بہادر شاہ نے عثمانی حکومت سے پرتگالیوں کے خلاف امداد طلب کی۔ سلطان کے حکم سے سلیمان پاشا والیٔ مصر، ستّر جنگی کشتیاں جن میں بیس ہزار سپاہی اور بڑی بڑی توپیں تھیں، لے کر برّ صغیر کی طرف روانہ ہوا۔ بحرِ احمر سے نکل کر پہلے تو سلیمان پاشا نے عدن پر قبضہ جمایا۔ پھر گجرات کے ساحل پر آ کر، پرتگالیوں کے قلعے منہدم کر دیئے۔ آخر میں ان کے بڑے مرکز "دیو" کا محاصرہ کیا، لیکن اسے فتح کئے بغیر، اموالِ غنیمت لے کر واپس چلا گیا اور عدن سے آگے بڑھ کر یمن کو فتح کر کے عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا۔

جس طرح ترکوں کی ترقی بتدریج ہوئی تھی، اسی طرح ان کا زوال بھی آہستہ آہستہ ہوا۔ اور یہ ارشادِ ربّانی تلك الايام نداولها بين الناس کا فطری قانون ہے۔ جو اٹل ہے۔ خاص کر شخصی اور استبدادی حکومتوں کے سلسلے میں۔ ترک قوم بلاشبہ ایک بہادر قوم تھی اور اسی بہادری کے نشے میں اس نے ملک کا نظم ونسق چلانے میں دماغی تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کے مقابلے میں

اپنی بہادری کی صفت اور سپہگری پر زیادہ اعتماد رکھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنی مفتوح اقوام سے نہ تو خود کوئی نفع اٹھا سکے اور نہ ہی انہیں کوئی نفع پہنچا سکے۔ غیر مسلم اقوام کے علاوہ خود مسلمان تو میں جو ان کے قبضے میں آئیں وہ ان کی جنسیت اور عصبیت کو اپنے ساتھ متحد یا موافق نہ بنا سکیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق، ایران اور مصر کی مفتوحہ زمینوں کو فوج میں تقسیم کرنے کی بجائے انہیں مقامی باشندوں کے تصرف میں رہنے دیا۔ اس حسنِ سلوک کی وجہ سے مقامی باشندوں کی قومی عصبیت فنا ہو گئی اور وہ اسلامی قوت کا فرد بن گئے۔ مگر ترکوں نے اپنی مفتوحہ قوموں کے علاقے سپاہیوں میں بانٹ دیئے، جنہوں نے کاشت کاروں پر ظلم کئے۔ ان جاہل آقاؤں کی بدسلوکی کی وجہ سے، ان اقوام میں حکومت کے لیئے ہمدردی پیدا نہ ہو سکی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت میں جس قدر کمزوری آتی گئی اسی قدر مفتوحہ اقوام میں اپنی علیحدہ جنسیت کا احساس اور آزادی کا خیال بڑھتا گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۲۰۱ھ میں جب روس اور اسٹریا نے دولتِ عثمانیہ پر چڑھائی کی تو اس وقت بلقان کے بہت سے اصلی باشندے، دشمنوں سے جا کر مل گئے، اور ترکوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ لڑائی ختم ہو جانے کے بعد جب یہ باشندے واپس آئے، تو ترک جاگیرداروں نے انہیں باغی قرار دے کر ان پر سختیاں شروع کیں۔ جس کی وجہ سے ایک فتنہ برپا ہو گیا۔ آخر میں عثمانی حکومت نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور ترک فوجیوں کے قبضے سے زمینیں نکال لیں۔ اس پر فوج نے بغاوت کر دی اور ان کے ایک سردار بازند اُوغلی نے کوشش کر کے ان کی اراضی انہیں واپس دلا دی۔ فوجیوں نے پھر وہی مظالم شروع کر دیئے۔

مفتوحہ ممالک کے اصل باشندے جو جنگ وپیکار سے واقف ہو چکے تھے، مقابلے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سربیا کے ایک رئیس، "پیتروفش" کی قیادت میں ایک قومی کونسل قائم کر کے سلسلہ وار جدوجہد شروع کی، یہاں تک کہ آخر میں آزادی حاصل کر کے رہے۔

عثمانی حکومت کا سب سے بڑا خطرناک دشمن روس تھا۔ خاص طور پر اس کا شاہنشاہ پیٹر اعظم، جس نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا، روس کے مقاصدِ حیات میں داخل کر لیا تھا۔ سلطان احمد ثالث کے عہد میں جب اس نے عثمانی علاقے پر لشکر کشی کی، تو اس وقت محمد پاشا صدرِ اعظم نے جو دو لاکھ فوج لے کر اس کے مقابلے کے لئے گیا تھا، دریائے پروت کے متصل ایک قلعہ میں اسے مع اس کی محبوب ملکہ کیتھرائین کے محصور کر لیا۔ اس موقع پر اگر دیانت اور صبر سے کام لے کر اس نے دونوں کو گرفتار کر لیا ہوتا، تو ترکوں کی بہت سی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جاتا، جس سے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کو بھی طاقت حاصل ہو جاتی۔ لیکن ملکہ مذکور نے اپنے زیورات اور جواہرات اس کے پاس بھیج دیئے جس کی وجہ سے اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور یہ عہد لے کر کہ روس قازق قوم کے معاملے میں دخل اندازی نہ کرے گا، واپس چلا گیا۔

ترکوں اور بالخصوص ان کے علماء میں تقلید اور قدامت پرستی زیادہ تھی، اور آزادیٔ فکر اور وسعتِ نظر کم تھی۔ اس لئے انہوں نے اکثر جدید اصلاحات کی مخالفت کی، اور مذہب کے نام پر جدید علوم وفنون کی ترویج میں روکاوٹ بن گئے۔ سلطان سلیم ثالث نے ۱۲۰۶ھ میں جب جدید مغربی طرز کی فوجیں تیار کرنی شروع کیں اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے

ملٹری اسکولوں کی بنیاد رکھی، تو رجعت پسندوں نے قیامت برپا کر دی۔ اور یہی نہیں کہ ان اصلاحات کے حامی وزراء کو قتل کر ڈالا گیا، بلکہ خود سلطان سلیم کو تخت سے اتار دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ شیخ الاسلام عطاء اللہ افندی نے جدید فوجی لباس کو خلافِ شریعت قرار دے دیا تھا۔

دوسری طرف عثمانی سلطنت کے حریف یورپ نے دورِ جہالت و تشتت سے نکل کر، علم اور وحدتِ قومی کی طرف قدم بڑھا لیا تھا، اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کر کے ترکوں کو پیہم شکستیں دینے لگا۔ یہانتک کہ ترکی سلطنت کے حصّے بخرے کرنے کے منصوبے باندھ لئے گئے تھے اور رفتہ رفتہ عثمانی مقبوضات کو یکے بعد دیگرے، ان کے قبضے سے نکالنا شروع کر دیا۔ جس کے باعث دولتِ عثمانیہ جو سلطان سلیمانِ اعظم کے عہد میں سب سے بڑی عالمی طاقت تھی۔ اب گھٹتے گھٹتے ایک معمولی سلطنت رہ گئی تھی۔ یوروپین اقوام نے صرف اسی پر بس نہ کیا، بلکہ جونہی عثمانی حکومت میں کمزوری کے آثار نظر آنے شروع ہوئے، انہوں نے دُور دراز کے اسلامی علاقوں پر دست درازی کرنی شروع کر دی تھی۔ یہانتک کہ انیسویں صدی کے نصف تک اکثر اسلامی ممالک ان یوروپین اقوام کے قبضے میں آچکے تھے۔

مسلمانوں کے دَورِ زوال کا عدالتی نظام

یورپی اقوام کی یلغار کے نتیجے میں تقریباً تمام اسلامی ممالک ان کے قبضے میں آچکے تھے، ان میں آزاد حیثیت سے ایک ترکی ہی بچا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ غلبہ حاصل کرنے والی اقوام یورپ کی اندرونی کش مکش کی وجہ سے انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں روس کی طاقت نہ بڑھ جائے۔ دوسرا ملک سعودی عرب تھا، جو نیم آزاد حیثیت رکھتا تھا۔

کیونکہ مکہ مکرمہ کے حکمران شریف حسین نے انگریزوں سے سازباز کر کے، ترک فوجوں کو جو حجاز میں قیام پذیر تھی، مار کر نکال دیا، اور نومبر ۱۹۱۶ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اور انگریزوں کے سائے میں حکومت کرنے لگا۔ مکہ مکرمہ چونکہ مسلمانانِ عالم کا مقدس مقام تھا، اس لئے انگریزوں نے یہاں پر براہِ راست قبضہ نہ کیا۔ ترکی کے دورِ زوال میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے اسے بھی متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ عدلیہ کے حکام نے محسوس کیا، کہ جامد فقہ کے جامد قانون، موجودہ دور کے عدالتی نظام کے لئے کفایت نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے کہ اس وقت ترکوں میں روشن دماغ علماء کی کمی تھی، جو انہیں قرآن مجید کے احکامات کی طرف لوٹاتے۔ اس دینی جمود کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر سے بعض یورپی قوانین اختیار کرنے شروع کئے اور عجیب اتفاق ہے کہ اس سلسلے میں اتنی بڑی تبدیلی پر علماء کی جانب سے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہ کیا گیا۔

مجلة الاحكام العدلية

اسلام کے مدنی قوانین کو زمانے کے جدید تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے مدوّن کرنے کے لئے علماء اور قانون دانوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جنہوں نے "مجلة الاحكام العدليه" کے نام سے اسلام کا دیوانی قانون مرتب کیا۔ یہ مجموعہ قوانین عام طور پر مجلہ کے نام سے مشہور ہے اور اس کی تفصیلات ہم نویں باب میں بیان کر چکے ہیں۔ اس مجلے

میں صرف ایک دو مسائل میں حنفی فقہ کو ترک کر کے دوسرے فقہی مذاہب کے فتاوی اختیار کئے گئے تھے۔ جسے حنفی علماء نے ناپسند کیا۔ یہانتک کہ اس کمیٹی میں ان کے نمائندے علامہ ابن عابدین نے کمیٹی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس جمود کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کو یورپ کے پنجے سے نجات دلا کر، اس کی خودمختاری بحال کی تو اس نے خلافت کے قدیم اسلامی ادارے کو ختم کر کے ایک سیکولر جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ جس سے خلافت کا یہ عظیم منصب مع اپنے تمام فوائد کے، نہ صرف ترکوں بلکہ جملہ مسلمانانِ عالم کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر علماء کے جمود کے خلاف نئی حکومت کا ردِّ عمل اتنا شدید تھا کہ عدالتی نظام تو ایک طرف، ترکی نے ہر بات میں مغرب کی تقلید کرنی شروع کر دی۔ یہانتک کہ جملہ باشندوں کے لئے مغربی لباس کو بھی لازم قرار دے دیا۔ ترکی زبان کا رسم الخط عربی تھا، اسے بھی قانوناً لاطینی حروف میں بدل دیا گیا۔ مختصر یہ کہ اسلامی مشرق سے سارے رشتے توڑ دیئے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ قدیم جامد ذہنیت بالکل بدل جائے، جو ان کے خیال کے مطابق ترکی کے زوال کا سبب بنی تھی۔

مصر کا عدالتی نظام

یہ تو اس ملک کا حال تھا، جو اپنے معاملات میں بالکل آزاد تھا۔ جب اس نے اپنا عدالتی نظام یورپ کی طرز پر ڈھال لیا، تو دوسرے ممالک میں، اسلام کے عدالتی نظام کی کہاں گنجائش تھی۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی یوروپی اقوام کے محکوم ہو چکے تھے۔ ہاں ان میں ایک ملک سعودی عرب ایسا تھا کہ جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا رہا کہ وہاں اسلام کا ہی عدالتی نظام نافذ رہا۔ باقی تمام اسلامی ممالک میں مختلف یوروپی ممالک کے قوانین نے جگہ لے لی۔ تاہم ان فاتح یوروپی اقوام

نے شخصی قانون کی حد تک ، اپنی مفتوحہ اقوام کو آزادی دے رکھی تھی ، کہ وہ اس سلسلے میں اپنے تنازعات ، اسلامی قانون کے مطابق طے کرا سکتے تھے۔ مسلمانوں کے عام جمود کی وجہ سے فقہ کی کتابوں میں بیان کردہ شخصی قوانین زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے ۔ اس وقت تک ان ممالک میں اہلِ علم کا ایک طبقہ ، یورپ کی علمی تحریکوں سے روشناس ہو چکا تھا ۔ چنانچہ ان کی طرف سے مطالبہ ہونے لگا کہ ملوکیّت کے ہزار سالہ اثرات کی وجہ سے مسلمانوں کے شخصی قوانین میں جو خرابیاں گھس آئی ہیں ، انہیں دُور کیا جائے ۔ اس سلسلے میں اوّلیت کا شرف مصر کو حاصل ہے ۔

عثمانی حکومت کے خاتمے کے بعد مصر کے دارالخلافہ قاہرہ نے تمام اسلامی دنیا کے لیئے ایک ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی تھی ۔ مصر میں شخصی قوانین کی تدوینِ نو کا کام سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں شروع ہوا ۔ جس کے لئے چاروں مشہور فقہی مذاہب یعنی حنفی ، مالکی ، شافعی اور حنبلی کے علماء پر مشتمل ایک بورڈ بنایا گیا ۔ اس بورڈ نے پورے چھ سال کی محنت سے ایک مسودہِ قانون مرتب کیا ۔ لیکن جب وہ مسودہ قانون شائع کیا گیا ، تو ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی ، اور حکومت نے اسے بحیثیتِ قانون نافذ کرنے کا خیال ترک کر دیا ۔

۱۹۲۰ء میں حکومتِ مصر نے دوبارہ ایک اسلامی قانون کمشن قائم کیا ، جس میں شیخ الازہر رئیس المحکمۃ العالیۃ الشرعیۃ اور مفتیء مصر وغیرہ شامل تھے ۔ اس کمشن نے اسی سال عائلی قوانین کے متعلق چھ امور کے بارے میں بطورِ اصلاح اپنی سفارشات پیش کیں ۔ جنہیں بطورِ ملکی قانون نافذ کر دیا گیا ۔ اس قانون سے قبل ، مصر میں ضابطہ تنظیم عدالت ہائے شرعیہ مجریہ ۱۹۱۰ء کی

دفعہ ۱۰ کے تحت شخصی معاملات میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مفتیٰ بہ اقوال پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے اس قانون کے ذریعے اس دفعہ میں ترمیم کر دی گئی۔ اور نان نفقہ، عدّت اور مفقود الخبر خاوند[1] کے سلسلے میں امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے فقہی مذاہب کے مطابق عملدر آمد کیا جانے لگا۔

اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں حکومت مصر نے ایک قانون کے ذریعے، ان مروجہ فقہی قوانین کو منظور کیا، جن میں طلاق بحالتِ نشہ اور طلاقِ جبریہ کو باطل اور طلاق بالکنایۃ[2] کو غیر نافذ قرار دیا گیا۔ الا یہ کہ طلاق دینے کی نیت ہو۔ ۱۹۴۳ء میں قانونِ میراث اور ۱۹۴۶ء میں قوانینِ وقف اور وصیت نافذ کئے گئے۔ جس کے بعض احکام حنفی فقہی مذہب سے مختلف ہیں اور آج صورت یہ ہے کہ مصر میں عائلی قوانین احکام الشرعیۃ فی الاحوال الشخصیۃ کے نام سے دفعہ وار مدون شکل میں موجود ہیں۔ اور جس وقت یہ مدون ہوئے، برصغیر ہند و پاکستان نے بھی اس کوشش کی بڑی تعریف کی۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب "حقوق الزوجین" میں ہماری عائلی زندگی کی اصلاح کے بارے میں جو سفارشات کی گئی ہیں۔ اور پھر ۱۹۶۱ء میں پاکستان میں جو

---

[1] ایسا خاوند کہ جو غائب ہو گیا ہو۔ اور اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ حنفی فقہ میں ایسے شخص کی بیوی کے لئے لازم ہے، کہ وہ نوّے سال تک اس کا انتظار کرے۔ لیکن یہ چونکہ ظلم تھا۔ اس لئے مالکی مذہب کے مطابق چار سال کی مدّت اختیار کی گئی۔

[2] اشاروں سے طلاق دینا۔

عائلی قوانین نافذ ہوئے، وہ انہی مصری قوانین کے عین مطابق ہیں۔

شام کا عدالتی نظام شام میں "قانون المدنی" کے نام سے ۱۹۳۰ء سے مجلۃ الاحکام العدلیہ ہی نافذ العمل ہے۔

البتہ عائلی قوانین کے سلسلے میں مصری قوانین کو اختیار کرنے کی بجائے چاروں فقہی مذاہب کی تفصیلات سامنے رکھ کر، مقامی حالات کے مطابق کچھ ردوبدل کیا گیا۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، ان میں مزید اصلاح کی گنجائش محسوس کی گئی۔ اور شام کی وزارت عدل نے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں شیخ الطنطاوی کو مسلمانوں کے شخصی قوانین کی تدوین کے کام پر مامور کیا۔ اسی دوران شام کا ملک آزاد ہو گیا۔ اور شیخ الطنطاوی نے پورے چار سال میں یعنی ۱۹۴۸ء میں ان قوانین کو ایک مسودہ کی شکل میں تیار کر کے حکومت کے حوالے کیا۔ حکومت نے اس کی جانچ پڑتال کے لئے ۱۹۴۹ء میں پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمشن قائم کیا، جس نے مسودے پر نظر ثانی کی۔ لیکن اس نظر ثانی کو کافی نہ سمجھا گیا اور اس مقصد کے لئے ایک دوسرا کمشن قائم کر کے مزید اصلاح کروائی گئی۔ لیکن چونکہ بعض معاملات میں سفارشات حنفی فقہ کے خلاف تھیں، اس لئے حنفی علماء کی جانب سے ان کی سخت مخالفت کی گئی۔ لیکن مخالفت کے باوجود حکومت نے ستمبر ۱۹۵۳ء کو ان قوانین کو "قانون الاحوال الشخصیۃ" کے نام سے نافذ کر دیا۔ اس قانون کے ذریعے شادی کے لئے لڑکی کی عمر سترہ سال اور لڑکے کے لئے اٹھارہ سال مقرر کی گئی۔ اسی طرح دوسری شادی کے لئے بھی حکومت کی اجازت ضروری قرار دی گئی۔ اس اجازت کا دارومدار مرد کی مالی استطاعت پر رکھا گیا۔ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر بیوی کو جدا کر دینے کو قانوناً جرم قرار دے دیا گیا۔ وصیّت کے احکام میں بھی کئی تبدیلیاں کی

گئیں، چنانچہ مالکی فقہ کو اختیار کرتے ہوئے شخص معدوم کے لئے وصیّت کو جائز قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح مالکی مذہب کے مطابق اگر کسی شخص کے حق میں وصیت کی گئی ہو۔ اور وہ شخص وصیّت کرنے والے کا قاتل ہو، تو اس صورت میں وصیّت کے تحت لینے شخص کو کچھ حصّہ بھی نہ ملے گا محروم وراثت پوتے کے لئے وصیّت کرنا واجب قرار دے دیا گیا۔ اور اس وصیّت میں جائیداد کی مقدار اتنی ہونی چاہیئے جتنی کہ اس کے باپ کو وراثت میں ملتی، اگر وہ اس کے دادا کی موت کے وقت بقیدِ حیات ہوتا۔

ایران کا عدالتی نظام

انقلابِ مشروطیت کے بعد مظفر الدین قاچار نے ایران میں آئینی حکومت کا اعلان کیا، اور ۱۹۰۶ء میں ایک فرمان کے ذریعے آئینی حکومت قائم ہوگئی۔ اس حکومت کی مجلسِ شوریٰ نے ۱۹۰۸ء میں اپنا قانونِ اساسی منظور کیا۔ ایران چونکہ ایک آزاد ملک تھا۔ اس لئے قانون سازی میں اسے مکمل آزادی تھی، لیکن اس کے باوجود، فوجداری قوانین، یوروپین قوانین سے اخذ کئے گئے، شخصی قوانین میں ایک ہی مجلس میں تین طلاقوں کا مسئلہ سب سے زیادہ اصلاح طلب تھا۔ لیکن شیعہ فقہ میں اسے پہلے ہی طلاق کا غیر اسلامی طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے شخصی قوانین میں ایران کو ان مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا، جو دوسرے مسلمان ممالک میں قدامت پسند علماء کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔

برّصغیر ہند وپاکستان کا عدالتی نظام

انگریزوں نے برصغیر ہند و پاکستان، پر قبضہ کر لینے کے بعد اپنا فوجداری نظام کو نافذ کیا، لیکن یہاں کے باشندوں کو اپنے شخصی معاملات یعنی شادی، طلاق، وراثت، وصیّت وغیرہ میں اپنے مذہبی قانون کے مطابق عمل

کرنے کی پوری آزادی دی۔ شخصی معاملات کے مقدمات کے فیصلے اگرچہ حنفی فقہ کے مطابق کئے جاتے تھے، لیکن ان پر عمل درآمد انگریزی عدالتوں کی معرفت ہی ہوتا۔ اس مقصد کے لئے ہملٹن نامی ایک انگریز قانون دان نے حنفی فقہ کی مشہور کتاب "ھدایہ" کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر لیا تھا۔ بعض معاشرتی خرابیوں کو روکنے کے لئے خود مسلمان اہلِ علم کی تحریک پر، ان شخصی قوانین میں کچھ اصلاحات کی گئیں۔ مثلاً ۱۹۲۹ء میں ایک قانون کے ذریعے صغر سنی کی شادیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ۱۹۳۹ء میں مسلمان عورتوں کو خلع کا حق دلانے کے بارے میں ایک قانون منظور ہوا اس قانون کے تحت چار سال تک مفقود الخبر رہنے والے خاوند کی بیوی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

فوجداری اور دیوانی عدالتیں

ابتدائی اسلامی ادوار میں فوجداری مقدمات کا فیصلہ زیادہ تر خلفاء اور سلاطین خود ہی کیا کرتے تھے، اور قاضیوں کے سپرد عام طور پر دیوانی مقدمات ہی کئے جاتے تھے۔ برّ صغیر کے دورِ محکومی میں فرق یہ ہوا کہ فوجداری قوانین، یورپی ممالک کے فوجداری قوانین کی نہج پر ترتیب دیئے گئے، اور اسی کے مطابق سرکاری عدالتوں میں مقدمات کے فیصلے ہونے لگے۔ دیوانی مقدمات میں جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق تھا، اس بارے میں مکمل مذہبی آزادی کا وعدہ کیا گیا۔ اور تمام باشندوں کو اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق اپنے شخصی معاملات کے فیصلے کرائیں۔ اسلامی ادوار میں دیوانی مقدمات زیادہ تر شخصی معاملات تک ہی محدود تھے۔ موجودہ زمانے میں جو ان مقدمات میں وسعت پیدا ہو گئی ہے، تو وہ بھی مسلمانوں کی

محکومی کا نتیجہ ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی دورِ حکومت میں برّصغیر کی تمام اراضی کو عملاً اسلامی بیت المال (سرکاری خزانہ) کی ملکیّت سمجھا جاتا تھا، یہ کسی فرد یا شخص کی ملکیّت نہ ہوتی تھیں۔ اس لئے زمین کی ملکیّت کے جھگڑے وغیرہ کے بارے میں آج جو دیوانی مقدمات وجود میں آئے ہیں اسلامی دور میں ان کا وجود تک نہ تھا۔ تاہم انگریزوں نے ۱۷۹۳ء میں بنگال کے بندوبست دوامی کے ذریعے ملکیّت زمین کے بارے میں اسلامی انتظام ختم کر دیا تھا، اور جو لوگ اس زمانے میں حکومت کی جانب سے زمین کی نگرانی پر مامور تھے، انہیں ان اراضی کا مالک بنا دیا۔ بعد میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد اس قانون کو سارے برّصغیر پر نافذ کر دیا گیا۔ اس سے نئے حاکموں کا جو مقصد تھا، اس کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ تبدیلی اپنے ساتھ اراضی کے تنازعات کی ایک فصل بھی ساتھ لائی، چونکہ ان تنازعات سے نپٹنے کے لئے اسلامی ادوار میں کوئی قانون نہیں تھا۔ تو انگریزوں نے بغیر کسی تردّد کے اپنی ملکی قوانین نافذ کر دیئے، اور ابھی تک یہی حالت ہے۔ حالانکہ انگریزوں سے آزادی حاصل کئے ہوئے پورے چھتیس سال گزر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی قانون نافذ کرنے کے لئے چونکہ اراضی پاکستان کی اصل خراجی حیثیت بحال کرنی پڑتی ہیں۔ یعنی یہ کہ یہ کسی فرد یا شخص کی ملکیّت نہ رہیں گی، بلکہ اسلامی بیت المال کی ملکیّت تصوّر ہوں گی۔ اس لئے اس بارے میں کوئی حتمی اقدام نہیں اٹھایا جا رہا۔

پاکستان میں عائلی قوانین کا نفاذ

اسلامی قانون کی تدوین نو کے سلسلے میں پاکستان میں جو پہلی کوشش کی گئی ہے، وہ ہے ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین کا نفاذ۔ قیامِ پاکستان کے تقریباً آٹھ سال بعد اگست

۱۹۵۵ء میں حکومتِ پاکستان نے سات افراد پر مشتمل عائلی قوانین کی اصلاح کے لئے ایک کمشن مقرر کیا جس کے صدر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ناگہانی وفات کے بعد پاکستان کے اس وقت کے چیف جسٹس جناب عبدالرشید صاحب کو اکتوبر ۱۹۵۵ء میں اس کمشن کا صدر بنا دیا گیا۔ اس کمشن نے اپنی رپورٹ جون ۱۹۵۶ء میں حکومتِ پاکستان کو پیش کر دی، جو ۲۰ جون ۱۹۵۶ء کے گورنمنٹ گزٹ میں شائع کی گئی۔ یہ رپورٹ کم وبیش انہی خطوط پر تیار کی گئی تھی کہ جن خطوط پر مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں شخصی قوانین کے سلسلے میں پہلے کام ہو چکا تھا۔ مثلاً دوسری شادی پر کچھ پابندیاں، ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دینا، صغر سنی کی شادیوں پر پابندی، نکاح کی رجسٹریشن کرانی اور محروم وراثت پوتے کو وراثت میں حق دلوانا وغیرہ وغیرہ۔

مصر میں جب یہی قوانین مدون اور بعد میں نافذ ہوئے تھے تو ہمارے ہاں اس اقدام کی بڑی تعریف کی گئی تھی۔ اور بعض حلقوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا، کہ برّصغیر میں بھی ایسے قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ لیکن جب ایسا اقدام اٹھانے کی عملی کوشش کی گئی، تو مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جب یہ مخالفت کا طوفان تھما تو ۱۹۶۱ء میں حکومت نے ان سفارشات کو قانونی شکل دے کر نافذ کر دیا۔ اس قانون کے ذریعے نکاح کی رجسٹریشن لازمی قرار دی گئی۔ دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی اور اس کے نان ونفقہ کی ضمانت کے بعد اجازت۔ ایک ہی مجلس میں تین طلاقوں اور صغر سنی کی شادی کی وجہ سے جو معاشرتی برائیاں پیدا ہو رہی تھیں ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ یتیم پوتے کو ہمارے معاشرے میں دادا کے ترکے سے محروم کر دیا گیا۔ ان عائلی قوانین میں اسے باپ کے وراثت میں حصے کے بقدر، وارث قرار دے دیا گیا۔ حق مہر کے بارے

میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر نکاح نامے یا معاہدہ شادی میں حق مہر کی ادائیگی کے طریق کار کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہ ہو، تو کل مہر، مہر معجل قرار پائے گا وغیرہ۔

عائلی قوانین اور اسلامی قانون کی تدوین جدید

پاکستان میں اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کے سلسلے میں عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ علماء کی سخت مخالفت کی وجہ سے آئندہ کسی قانون کی تدوین کی کسی حکومت کو جرأت نہ ہوئی۔ علماء کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان قوانین میں حنفی فقہ کے فتاوی کو ترک کر کے، دوسرے فقہی مذاہب کے فیصلے اختیار کر لیے گئے۔ حالانکہ مصر میں جب یہ قوانین نافذ کیے گئے تھے تو اس وقت بھی حنفی فقہ کی بجائے دوسرے فقہی مذاہب کے فیصلے اپنائے گئے تھے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے جب مصر کے ان عائلی قوانین کی روشنی میں اپنی کتاب "حقوق الزوجین" شائع کی، تو حنفی علماء کی مخالفت کی اس روش پر یوں تنقید کی :-

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گناہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے، اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ ہم نے تم کو علم وعقل سے اس لیے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو۔ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبیؐ کی سنت تمہارے پاس اس لیے تھی کہ تم اس کو لیے بیٹھے رہو، اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں۔ ہم نے اپنے دین کو آسان بنا دیا تھا۔ تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو، تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔

ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا، تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ، اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس بازپرس کے جواب امید نہیں کہ کسی عالمِ دین کو کنز الدقائق[۳]، اور ھدایہ[۴]، اور عالمگیری[۵] کے مصنّفوں کے دامن میں پناہ مل سکے۔[۶]

نکاح کی رجسٹریشن کے سلسلے میں انہوں نے عائلی قوانین کی معمولی رجسٹری سے بھی زیادہ سخت قسم کی رجسٹری تجویز کی تھی۔ حق مہر کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ :-

"لیکن اگر وہ مؤجل ہو تو لازم قرار دیا جائے، اور زرِ مہر پر پچاس فیصدی کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا پچاس فیصدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویزِ مہر قابل ادخالِ دعوٰے نہ ہو، اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے، تو مہرِ مؤجل کا یہ سرتاپا عیب، بآسانی مسدود ہو جائے گا۔[۷]

خیال رہے کہ ہمارے پاکستانی معاشرے میں زیادہ تر شادیوں میں حق مہر مؤجل ہوتا ہے۔ یعنی شادی کے موقع پر ادا نہیں کیا جاتا۔ بلکہ بعد میں جب کبھی میاں بیوی میں کوئی تنازعہ ہو تو اس کی ادائیگی کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

پاکستان عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء میں ایک سے زائد شادیاں روکنے کے لئے

۳ه، ۴ه، ۵ه حنفی فقہ کی معتبر اور مستند کتب۔

۶ه حقوق الزّوجین۔ از سیّد ابو الاعلیٰ مودودی۔ طبع ششم لاہور۔ صفحہ ۹۸

۷ه " " " " ۱۲۵

یہ پابندی عائد کی گئی کہ اس مقصد کے لیے پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کی جائے ۔ اس سلسلے میں اپنی کتاب "حقوق الزوجین" میں مودودی صاحب نے یہ لکھا تھا ۔

"قرآن مجید میں تعدد ازدواج کی اجازت ، عدل کی شرط کے ساتھ دی گئی ہے ۔ اگر کوئی شخص عدل نہ کرے ، تو اسے مشروط اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے ۔ خود اس آیت میں جس میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے ۔ صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کرسکو ، تو ایک ہی بیوی رکھو ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۔ (پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کرسکو گے ، تو ایک ہی بیوی رکھو ۔ یا لونڈی ، جو تمہارے قبضے میں ہو ۔ یہ زیادہ قرینِ مصلحت ہے ۔ تاکہ تم حق سے متجاوز نہ ہو جاؤ) .... مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا ، اور ایک طرف جھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ ظالم ہے ۔ تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے ۔ قانون کو ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیئے ، اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیئے ۔ [۸]

---

[۸] ایضاً صفحہ ۴۱ ، ۴۲

عائلی قوانین میں کم سنی کی شادیوں کو ختم کرنے کے لئے نکاح کی کم از کم عمر مقرر کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مودودی صاحب نے اپنی اسی کتاب یعنی حقوق الزّوجین میں چالیس سال پہلے یہ مطالبہ کیا تھا:۔

"اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے، اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لڑکے، جن سے ابتداء میں اچھی توقعات قائم کی جاتی رہیں۔ آگے چل کر سخت بد اخلاقیوں، اور بُری عادتوں، اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں"۔ [۹]

ہمارے معاشرے میں ایک ہی جگہ بیٹھے بیوی کو تین طلاق دینے کا جو غیر اسلامی طریقہ مروج ہو چکا تھا، اس سے کئی برائیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ عائلی قوانین مجریہ سال ۱۹۶۱ء میں اس طریقہ طلاق پر پابندی لگا کر طلاق دینے کا صحیح اسلامی طریقہ رائج کر دیا گیا۔ جس کی مودودی صاحب سمیت بہت سے علماء نے مخالفت کی۔ حالانکہ چالیس سال پہلے اس برائی کے خاتمے کے لئے مودودی صاحب خود یہ مطالبہ کر چکے تھے:۔

"بیک وقت تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوصِ صریحہ کی بناء پر معصیت ہے۔ علمائے امّت کے درمیان اس مسئلہ پر جو کچھ اختلاف ہے، وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں، ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں، یا تین طلاق مغلظہ کے حکم میں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے

---

[۹] ایضاً صفحہ ۱۱۹

میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقے کے خلاف ہے، جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے، اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام غصے میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا "ایلعب بکتاب اللہ عزّ وجلّ وانا بین اظھرکم۔ (کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں) بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے، کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس فعل کو معصیت فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو روایات میں یہانتک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلس واحد میں تین طلاقیں دینے والا آتا تو وہ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فعل پر سزا دی جا سکتی ہے۔ [۱۰]

ان تفصیلات کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے عدالتی نظام کو قابلِ عمل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی قوانین کا ایسا مجموعہ موجود ہو، جو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ لیکن جب ایک شعبے یعنی عائلی زندگی کے بارے میں اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کی گئی، اور یہ تدوین قرآن وسنت کے عین مطابق تھی، لیکن حنفی فقہ کے خلاف تھی تو علماء کی

---

[۱۰] ایضاً صفحات ۱۵۴، ۱۵۵

جانب سے، اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ حالانکہ جیسا کہ مودودی صاحب کی تحقیق کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ تدوین ان کی اپنی تحقیقات کے بھی مطابق تھی۔ اس صورتِ حالات سے حکومتیں اس حد تک پریشان ہوئیں کہ انھوں نے اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کے کام میں دلچسپی لینی ترک کر دی۔ اور اب صورتِ حالات یہ ہے، اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی چوالیس مملکتیں آزاد ہو چکی ہیں۔ ان مملکتوں میں روشن خیال علماء کی بھی کمی نہیں۔ لیکن جامد اور قدامت پسند علماء کی اس قسم کی مخالفت کی وجہ سے کسی ملک کو اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

حکومتِ پاکستان نے اس مقصد کے لئے ۱۹۶۲ء میں اسلامی تحقیق کا ایک ادارہ قائم کر دیا تھا اور اُسے اسلامی قانون کی تدوین جدید کی یہ ذمہ داری سونپی۔ یہ ادارہ اگر چاہتا تو پچھلے بیس سال میں تمام اسلامی قانون کی تدوینِ جدید مکمل کر لیتا۔ لیکن علماء کی مخالفت کے ڈر سے وہ اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ اب اس کام کی قابلِ عمل صورت صرف یہ رہ گئی ہے کہ مختلف مکتبِ فکر کے علماء باہمی تعاون سے، اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کا کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اسلام کا عدالتی نظام چونکہ سستا اور سادہ ہے، اس لئے عوام کی جانب سے اس کے نفاذ کا مطالبہ زیادہ زور پکڑتا جاتا ہے۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے اس سلسلے میں کچھ ابتدائی اقدامات بھی اٹھائے جا چکے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تھانے کی سطح پر قاضی مقرر کئے جانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے، لیکن اس مقصد کے لئے جس بنیادی کام کی ضرورت ہے۔ اس کی طرف کما حقہٗ، توجہ نہیں

دی جا رہی ، اور وہ یہ کہ اسلامی قانون کی موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق ، تدوینِ جدید کی جائے ، تاکہ قاضی حضرات اس نئے مجموعہ قوانین کے ذریعے ، اسلام کے عدالتی نظام کو عملاً عامۃ النّاس کے سامنے پیش کر سکیں۔

دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ایسا ہی مطالبہ دن بدن زور پکڑتا جا رہا ہے ، لیکن ان ممالک میں بھی ابھی تک اسلامی قانون کی تدوینِ جدید نہیں ہوئی جو اسلام کے عدالتی نظام کے چلانے کے لئے ایک اہم بنیاد ہے۔ مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر مرحوم نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اسلامی قانون کا ایک انسائیکلوپیڈیا تیّار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اگر وہ مکمل ہو جاتا ، تو بلاشبہ ساری اسلامی دنیا کے قاضی اس سے فائدہ اٹھا سکتے۔ لیکن ابھی اس انسائیکلوپیڈیا کی دس ہی جلدیں تیار ہوئی کہ صدر جمال عبدالناصر کی وفات کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ تاہم کویت اور سعودی عرب میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سلسلے میں وہاں کیا پیش رفت ہوئی۔ اس وقت تک اس اہم کام کے نمونے کے صفحات ہی نظر سے گذرے ہیں۔

خاتمہ مختلف اسلامی ممالک میں اسلامی قانون اور اسلام کے نظامِ عدل کو نافذ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ پیش رفت ضرور ہوئی ہے۔ اور متعلقہ حکومتوں کو اس راستے کی مشکلات کا علم بھی ہو چکا ہے۔ تاہم اسلام کے عدالتی نظام کے کامیابی سے چلانے کے جس قسم کے سادہ معاشرے کی ضرورت ہے ، اس کی طرف ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس راستے کی دوسری رکاوٹ ، اسلامی قانون کے ماہروں کی کمی ہے۔ علماء حضرات جنہیں اسلامی قانون کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ وہ جدید قانونی لوازمات سے نابلد ہیں ، اسی طرح

موجودہ دور کے قانون دان اسلامی قانون کی مکمل واقفیت نہیں رکھتے ۔ چنانچہ ان دونوں طبقات کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے مختلف اسلامی ممالک میں شریعت کالج قائم کئے جا رہے ہیں ۔ پاکستان میں جامعہ اسلامیہ اسلام آباد، اس سلسلے کی طرف ایک اہم قدم ہے ۔ امید ہے کہ اس یونیورسٹی کی شریعت فیکلٹی کے تعلیم یافتہ قانون دان اسلامی قانون اور زمانہ جدید کے قانونی نظام کی مہارت حاصل کرنے کے بعد، وطنِ عزیز میں اسلام کے عدالتی نظام کے قیام میں صحیح معنوں میں ممد و معاون ہوں گے ۔